قلعۂ فراموشی
فہمیدہ ریاض
آکسفرڈ

قلعۂ فراموشی

فہمیدہ ریاض

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔
یہ دنیا بھر میں بذریعۂ اشاعت تحقیق، علم وفضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے مقاصد کے فروغ میں
یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے۔ Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں
اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے

پاکستان میں امینہ سیّد نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا،
پی۔او بکس ۸۲۱۴، کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان
سے شائع کی

پہلی اشاعت ۲۰۱۷ء

ISBN 978-0-19-940505-3

نوری نستعلیق فونٹ میں کمپوز ہوئی
۵۲ گرام نیوز پرنٹ کاغذ پر طبع ہوئی

واسا پرنٹرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی میں طبع ہوئی

اظہارِ تشکر

سرورق کی تصویر: "Clay fortress ruins in Kashan province of Iran"
بشکریہ: Anton Ivanov/shutterstock.com

انتساب

ہندوستان، پاکستان اور دنیا بھر میں رہنے والے پارسیوں کے نام جن کے اولین اعتقادات نے جدید عقائد اور تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی۔

گر قبول افتد زہے عزِ و شرف

''پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فیِ الارض دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی'' ہے

فیض احمد فیض

سرِوادیٔ سینا

فہرست

فہرست

ناخن کا قرض

(اس ناول کے بارے میں کچھ معلومات)

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا
(غالب)

کچھ اس طرح کے جذبات تھے جنھوں نے راقم الحروف کو یہ ناول لکھنے پر مائل کیا۔ مزدک کا نام تو ہم نے لڑکپن سے سن رکھا تھا کہ اسے تاریخ کا اولین اشتراکی انقلابی تسلیم کیا جاتا ہے اور وہ ایرانی نژاد تھا۔ لیکن اس بارے میں لوگوں کو بہت کم علم ہے کہ وہ کون تھا اس کی تحریک کن حالات میں پیدا ہوئی اور کن راستوں سے گزری، پھلی پھولی اور پھر کیسے ختم ہو گئی۔ پھر یہ سوال بھی ہے کہ دوسری تاریخی شخصیات کے مقابلے میں مزدک کے بارے میں آخر اتنی کم معلومات کیوں ملتی ہیں؟ اس آخری سوال کا جواب تو چھان بین کرنے کے اولین مراحل ہی میں سامنے آ جاتا ہے جب آپ دیکھتے ہیں کہ تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ مزدک اور اس کی اشتراکی تحریک کے بارے میں معلومات کو اس کے دور کے تمام واقعہ نگاروں نے دانستہ چھپایا ہے اور اگر کہیں ذکر ناگزیر ہی ہو گیا تو اسے نہایت اختصار سے منفی الفاظ تک محدود رکھا ہے۔ اس طرح بعد میں آنے والے مورخین کو وہ معلومات بھی نہ مل سکیں جن کی بنیاد پر وہ تحقیق کو آگے بڑھاتے اور مزدک رفتہ رفتہ تاریخ کے صفحات سے غائب ہوتا چلا گیا۔

طرفہ یہ کہ یہ قصہ کافی پرانا ہے۔ مزدک کا دور پانچویں صدی عیسوی کا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو ابھی محض چار سو برس ہی گزرے تھے جس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کا زمانہ کسی صحرا کی طرح پھیلا ہے جہاں تاریخ اور اینتھروپولوجی (علمِ بشریات) ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوتے رہتے ہیں اور ماقبل تاریخ ادوار فوراً ختم نہیں ہوتے بلکہ نئے ادوار کے ساتھ ساتھ دور تک چلتے رہتے ہیں (بلکہ عین ممکن ہے کہ خود سندھ کے کسی دور دراز جابلو (پہاڑی) بستی میں آج بھی چل رہے ہوں)۔ مزدک کی زندگی، حالات اور واقعات کی تصویر کشی اس لیے بھی مشکل بن جاتی ہے کہ تب سے اب تک، جہاں یہ واقعات ظہور پذیر ہوئے، ان علاقوں

کا سیاسی جغرافیہ کئی بار بدل چکا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں جو شہر اور صوبے موجود تھے وہ کئی بار اجڑ چکے ہیں، ان کی سرحدیں متعدد بار بدلی ہیں اور نام بھی اب وہ نہیں رہے۔

لیکن جب تلاش میں نکلے تو ایک نئے جہان کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ مزدک کی تحریک کے ساتھ ساتھ یہ اس خطے کی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی کہانی بنتی چلی گئی جو نہ صرف آج ہم تک پہنچا ہے بلکہ جس کی جڑیں اس سے پہلے کی صدیوں میں دور تک پھیلی تھیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ مزدک کے دور میں ایرانی سلطنت میں زرتشتی مذہب رائج تھا جو تاریخ کا غالباً قدیم ترین ''باقاعدہ اور باضابطہ'' مذہب ہے۔ اس میں اور ہندومت میں اتنا کچھ مشترک ہے کہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون کس کی پیداوار ہے۔ اب محققین کا یہ کہنا ہے کہ ویدوں کے زمانے میں ہندوستان میں جو مذہب تھا (یا تھے) وہ غالباً قدیم ترین ہیں لیکن ان میں جو تغیر رونما ہوا اور جیسا کہ آج ہمیں نظر آ رہا ہے، زرتشتی مذہب اس سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایران میں آریہ آباد تھے اور ان کے نام پر ہی اس خطۂ زمین کا نام ایران پڑا ہے۔ (سابق شہنشاہِ ایران بھی ''آریہ مہر'' کا لقب استعمال کرتے تھے۔)

اس طرح یہ ناول دو ڈھائی برس کی مستقل چھان بین کا ثمر ہے۔ میری مدد مندرجہ ذیل ماخذات نے کی۔

ا۔ شاہنامہ

سب سے پہلے تو میں نے فردوسی کی مشہور زمانہ شاہنامہ سے رجوع کرنے کی ٹھانی۔ دسویں صدی عیسوی کے یہ ایرانی شاعر ابوالقاسم فردوسی (۹۴۰ء تا ۱۰۲۰ء) نہ صرف پچاس ہزار اشعار سے زیادہ پر مشتمل شاہنامہ کو مثنوی کی صورت میں موزوں کرنے کے لیے نامور ہیں، کیونکہ ایک واحد شاعر کا لکھا ہوا یہ دنیا کا طویل ترین رزمیہ ہے، بلکہ یہ علماء میں قدیم ایران کے منظوم تاریخ نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں اور مغرب و مشرق کے مورخین ان کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ شاہنامہ پاکستان میں آسانی سے دستیاب نہیں لیکن پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز (اسلام آباد) میں مجھے اس کی ایک کاپی مل گئی جس میں مزدک اور اس کی اشتراکی تحریک کے بارے میں دو تین صفحات پر مشتمل مواد بھی مل گیا لیکن بنیادی طور پر شاہنامہ نہایت جلیل القدر شہنشاہوں کی داستان ہے جن کے مقابلے میں یہ سرسری بیان تھا جس میں بہرحال مزدک کی زندگی کا آخری حصہ دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے اس لیے اسے اس ناول میں استعمال کیا جا سکا۔

۲۔ اَوِستا

ہزاروں برس قدیم زرتشتی مذہب اور اس کے پیروکار روئے زمین سے بالکل غائب ہی نہیں ہو گئے۔ یہ برصغیر آتے اور بستے رہتے ہیں اور ہماری جو ''پارسی کمیونٹی'' ہے یہ ہی زرتشتی ہیں۔ ان کی مذہبی کتاب کا نام اَوِستا ہے جو پارسی برادری آج بھی پڑھتی ہے اور اس سے مجھے زرتشتی زمزمے (حمدیں اور نعتیں) اور دیگر کچھ مواد مل سکا۔

یہ بنیادی مواد حاصل کرنے کے بعد ہم اس منظر نامے کی طرف آتے ہیں جہاں مزدکی تحریک پھیل رہی تھی اور بار آور ہو رہی تھی، اور وہ تھی ایرانی سلطنت، اور پھر ہمیں یہ بات مدِنظر رکھنی ہوتی ہے کہ یہ کس نوعیت کی تھی۔

مزدک جس دور میں پیدا ہوا تھا اس وقت ایرانی سلطنت پر کوئی ساڑھے چار سو برس سے جو ایرانی قبیلہ یا کنبہ حکمران تھا اسے ساسانی کہا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک عظیم الشان سلطنت تھی اور اتنا بڑا سامراج تھا کہ اس کی سرحدیں ایک طرف ہندوستان کے اندر تک پہنچی ہوئی تھیں اور دوسری طرف عرب سرزمینوں اور رومی سلطنت سے ٹکراتی تھیں، جن سے ان کی محاذ آرائی جاری رہتی تھی۔ یہ سرحدیں تبدیل ہوتی رہتی تھیں کیونکہ بعض اوقات کچھ علاقے رومی فتح کر لیتے تھے اور بعض اوقات ان پر ایرانیوں کا تسلط ہو جاتا تھا۔ ان میں ہی یروشلم بھی شامل تھا جہاں کی یہودی آبادیاں ساسانیوں سے بھی قبل ایرانی سلطنت میں آ آ کر بستی رہی تھیں اور یہیں توریت کا کچھ حصہ رقم ہوا تھا۔ علاوہ ازیں ایرانی سلطنت کی ایک سرحد پر سفید ہنوں کے قبائل بھی آباد تھے جو ایرانی سلطنت پر حملے کرتے رہتے تھے۔

یہ تھے وہ عناصر جو ایرانی سلطنت پر اثر انداز ہو رہے تھے، جو ایسے ''معروضی حالات'' تھے جن میں مزدک اپنی اشتراکی تحریک پھیلانے کے لیے کوشاں تھا۔ ان حالات کی کھوج میں مختلف ماخذ نہایت کارآمد ثابت ہوئے یعنی گو مزدکی تحریک کی باضابطہ تاریخ مورخین نے ہمیں نہیں دی لیکن لگن کے ساتھ نگاہ ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ؏

چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

۳۔ بائیبل

اس زمانے کے حالات مجھے بائیبل کے پرانے عہد نامے سے بآسانی ملے جس کے دو ابواب میں ایرانی سلطنت کا ذکر آتا ہے۔

۴۔ عربوں کی تاریخ از فلپ ہٹی

(*The History of the Arabs* by Philip Hitti)

مزدک کے دور تک عرب سرزمینوں پر اولین چھوٹی سی عرب بادشاہت ''حیرہ'' قائم ہو چکی تھی جو ایرانی سلطنت کی باج گزار تھی اور رومی (بازنطینی) سلطنت سے بھی ربط وضبط رکھتی تھی، جبکہ باقی کی عرب سرزمینوں پر آزاد بدو قبائل اور کنبے آباد تھے جو ایرانی سلطنت پر لوٹ مار کرنے کے لیے صدیوں سے حملے کرتے آئے تھے اور بعض اوقات ایرانی سلطنت میں رہائش بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کی عادات و اطوار، سماجی زندگی، رسوم و رواج کے بارے میں بہت مستند مواد مجھے لبنانی امریکی مورخ فلپ ہٹی کی کتاب عربوں کی تاریخ سے ملا۔ ناول میں بدو جو اشعار پڑھتے ہیں وہ میں نے اسی کتاب سے لیے ہیں۔ فلپ ہٹی لبنان کے رہنے والے عرب عیسائی تھے اور عربی ان کی مادری زبان تھی اسی وجہ سے قدیم مخطوطات اور کتبوں تک ان کی بخوبی رسائی تھی۔ (عربوں کی تاریخ پر اس سے بہتر کتاب میری نظر سے نہیں گزری ہے۔)

۵۔ تاریخِ طبری

''علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری'' کا طویل نام رکھنے والے یہ نویں اور دسویں صدی عیسوی کے مورخ دنیا بھر میں بہت معتبر مانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ ضخیم تاریخ تاریخ الرُسُل و الملوک کی جلد دوئم سے مجھے چوتھی اور پانچویں عیسوی صدی میں ایران، عرب سرزمینوں اور روم کے بارے میں بہت مستند تاریخی مواد مل گیا۔ علاوہ ازیں اس میں سفید ہنوں کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ جس سے ہن قبائل اور ان کے ایرانی شہنشاہوں سے تعلقات کے بارے میں معلومات ملیں جو اس ناول کی کہانی میں کام آئیں۔

۶۔ جغرافیۂ خلافتِ مشرقی از جی لی اسٹرینج

The Lands of the Eastern Caliphate

اس بے مثال تحقیقی کتاب کا حوالہ ہمیں نامور ادیبہ قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی کارِ جہاں دراز ہے میں بھی نظر آتا ہے۔ ناول کا منظر نامہ ترتیب دینے میں یہ کتاب اس لیے کار آمد ثابت ہوئی کیونکہ اس میں عربوں کے ایران فتح کرنے تک کا تمام سیاسی جغرافیہ نقشوں سمیت محفوظ ہے۔ گو عربوں نے ایک آدھ صدی میں کچھ شہروں کے نام تبدیل کیے لیکن شہروں، صوبوں اور دریاؤں کے کئی نام ایسے بھی باقی رہے جو ایرانی سلطنت میں مستعمل تھے۔

۷۔ ایران بعہدِ ساسانیان از ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین

L' Iran sous les Sassanides

by Dr Arthur Christensen

اوپر دیے ہوئے تمام ماخذوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ہمارا ناول قلعۂ فراموشی کبھی نہ لکھا جا سکتا اگر یہ کتاب میری رہنمائی نہ کرتی۔ اسے ڈنمارک کے رہنے والے ایک نامور مستشرق ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین نے تحریر کیا تھا۔ جو ماہر لسانیات بھی تھے۔ ان کی یہ تحقیقی کتاب قدیم ایران، خصوصاً ساسانی دور کی تہذیب وتمدن کا بھرپور مطالعہ ہے جس نے ناول کی پر اعتماد تشکیل میں میری بہت مدد کی کیونکہ شادی اور طلاق وغیرہ کی رسومات کے علاوہ اس نے مجھے ایسی معلومات بھی دیں کہ اس دور میں کیا کھایا اور پیا جاتا تھا اور وہ کیسے پکایا جاتا تھا، ملبوسات کون سے استعمال ہوتے تھے اور کس کپڑے سے بنائے جاتے تھے اور زیورات کے ڈیزائن کس قسم کے تھے۔

ان تمام ماخذات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کے سامنے ایک ایسا ناول پیش کر سکی ہوں جس میں ایک دو کے سوا تمام کردار اور واقعات تاریخی اور حقیقی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے اہم ترین مکالمے بھی تاریخی حقائق ہیں کیونکہ ان کا، انھی الفاظ کا کئی جگہ حوالہ دیا گیا ہے، مثلاً دربارِ شاہ میں چوبدار کا بیان، مزدک کی معاونت کے لیے بادشاہ کے الفاظ اور خود مزدک کا اپنی بعثت اور مقاصد کے بارے میں بیان اسی کتاب میں موجود ہیں اور ان اہم تاریخی باتوں کو مجھے اپنے تخیل کی مدد سے نہیں لکھنا پڑا ہے جس کے باعث جو کچھ میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں اسی کے استناد پر میرا اعتماد مضبوط اور قائم رہا ہے۔

۸۔ قدیم ہند کی تاریخ

ایک اور عنصر جس نے ساسانی سلطنت اور اس سے رابطے میں آنے والے سرحدی ممالک کی تاریخ بنانے میں کردار ادا کیا وہ قبائل تھے جن کو سنسکرت میں ''سفید ہن'' یا ''ہونان'' کہا گیا ہے۔

ان کا ذکر قدیم ہند کی تاریخ اور تاریخِ طبری میں موجود ہے۔ طبری نے انھیں ہبدالیوں کا نام دیا ہے۔ (اصل لفظ ہپھتالی تھا لیکن عربی میں ''پ'' اور ''پھ'' نہیں ہوتا)۔ یہ پولی اینڈرس قبائل تھے یعنی ایک عورت سے کئی مرد شادی کرتے تھے۔ (ہندوستان میں ہزاروں برس سے ان کے بس جانے سے ہندوستانی تاریخ کی مشہور کردار دروپدی کے متعدد شوہروں کا خیال آتا ہے کہ یہ رواج غالباً سفید ہنوں کے ذریعے ہندوستان کے کسی حصے میں پھیلا ہوگا۔ جو بعض دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں آج بھی موجود ہے۔)

۹۔ تاریخِ یہود

یہودیوں کی تاریخ ہمیں بائیبل کے پرانے عہد نامے سے ملی جبکہ نئے عہد نامے سے ہمیں اس وقت کے عیسائیوں کے رہن سہن اور رسم و رواج اور فکر کے بارے میں مستند معلومات ملتی ہیں۔ یوں تو ان موضوعات پر ان گنت کتابیں موجود ہیں لیکن میں نے بائیبل کو اور اس کی تفسیروں کو ہی اپنا ماخذ بنایا۔

۱۰۔ انٹرنیٹ

ناشکری ہوگی اگر انٹرنیٹ کی ان بے شمار فائلوں کا احسان نہ مانا جائے جو معلومات کے اس بے بہا خزانے نے تقریباً ہر صفحے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے فراہم کیں۔ اور جو تعداد میں اتنی زیادہ تھیں کہ ان کا ریکارڈ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

۱۱۔ ناول نگار کا تخیل اور ذہنی اُپج

چونکہ یہ ناول ہے اس لیے ظاہر ہے اس کی تصنیف میں میرے تخیل نے بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ ان تاریخی حقائق میں چلتے پھرتے کرداروں کو مجھے جیتے جاگتے انسان بنانا تھا جو ہنستے بولتے ہیں، غلطیاں بھی کرتے ہیں، خواب دیکھتے ہیں۔ اس طرح ناول میں چند ایسے کردار داخل ہوتے ہیں جو میرے اپنے تخیل کی تخلیق ہیں۔ کڑی سے کڑی ملانے میں ایک تاریخی کہانی کار کے ذہن کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ تو ایک دو جگہ تحریر ملا کہ قلعۂ فراموشی ایرانی سلطنت میں واقعی وجود رکھتا تھا۔ لیکن یہ

کس مقام پر تھا؟ ڈاکٹر کرسٹن سین کا کہنا تھا کہ ایسا ایک قلعہ خوزستان میں تھا جہاں خوز قبائل آباد تھے۔ اب تو عرصۂ دراز سے اس نام کا کوئی صوبہ وجود نہیں رکھتا۔ پھر کہیں یہ پڑھا کہ عرب فاتحین خوز قبائل کو "ہوز" قبائل کہنے لگے تھے۔ میرے دماغ میں خیال آیا کہ اس "ہوز" کو جب عربی زبان کے اصول کے مطابق جمع میں لکھیں گے تو کیا "اہواز" نہ ہو جائے گا؟ فوراً بے تابی سے جغرافیہ خلافتِ مشرقی کے ورق پلٹ کر "اہواز" نکالا اور یہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ عرب فاتحین یہاں قدیم ایرانی فنِ تعمیر کے نمونے دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ ایک ایسے قلعے کا ذکر بھی اس کتاب میں آتا ہے جہاں سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے۔ اس طرح مجھے اس قلعے کے واقعی کسی زمانے میں وجود رکھنے کا یقین ہوا اور یہ بھی کہ اس کا محلِ وقوع اہواز یا اس کا گرد و نواح ہی ہوگا۔ کون جانے کہ اس کی بچی کھچی نشانیاں آج بھی وہاں موجود ہوں!

تاریخی حوالہ جات ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ مزدکی اشتراکی تحریک سات سال تک جاری رہی۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک اتنی مضبوط اور پر جلال سلطنت میں ایسا کیونکر ممکن ہو سکا؟ لیکن جوں جوں ہم معروضی حالات کو سامنے لاتے ہیں اس سوال کا جواب واضح ہوتا جاتا ہے کہ مزدک کو شہنشاہِ وقت اور افواج کی حمایت حاصل تھی جن کی طاقت کو امراء اور مذہبی کاہن اور پیشوا ختم کرنا چاہتے تھے۔ بادشاہ اور فوج کو خود اپنے بچاؤ کے لیے مزدکی تحریک کی مدد کی ضرورت تھی جو عوام کی غریب، بھاری اکثریت میں مقبول تھی۔ جب سلطنت کے ان بھاری بھرکم ستونوں، یعنی امراء، مذہبی پیشوا، فوج اور شہنشاہ کا باہمی ٹکراؤ ختم ہوا تو شہنشاہیت کو مزدک کی ضرورت نہ رہی اور شہنشاہ کے بعد آنے والے اس کے بیٹے نوشیرواں نے مزدک اور مزدکیوں کو ٹھکانے لگانے میں دیر نہ کی۔

میری اس "محنتِ عشق" کا حاصل یہ ناول تو جیسا بھی ہے، آپ کے سامنے ہے لیکن یہ تاریخی کہانی یقیناً باشعور قارئین کو دعوتِ فکر دے گی۔

فہمیدہ ریاض

کراچی

نقشۂ سلطنتِ ساسانی

ا

قدیم ایران میں، صوبہ خوزستان میں ایک مضبوط قلعہ تھا جس کا نام ''گیل گرد'' تھا۔ آرمینی زبان میں اسے ''اندمشن'' کہا جاتا تھا۔ وہاں اس قسم کے سیاسی قیدیوں کو محبوس رکھا جاتا تھا جن کو عوامی فکر اور یادداشت سے قطعی غائب کرنا مقصود ہو۔ اس کو ''انوش برد'' بھی کہتے تھے جس کے معنی ''قلعۂ فراموشی'' کے ہیں۔ اس لیے کہ جو لوگ وہاں قید ہوتے تھے ان کا نام لینا، بلکہ خود قلعے کا نام لینا بھی ممنوع تھا۔

''اے حاظرینِ دربار! اپنی چشمِ بصیرت کھولو۔ تم میں سے ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے سے کم تر لوگوں پر نظر رکھے اور اپنے سے بلند تر رتبے والوں کو نہ دیکھے۔''

شاہی چوبدار بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔ دربار کے وسط میں کھڑا ہوا دوسرا چوبدار ان ہی الفاظ کو اسی طرح بلند آواز میں دُہرا رہا تھا تاکہ جو حاظرین دیوار سے لگے کھڑے ہیں ان تک یہ فرمان پہنچ جائے جو صدیوں سے مملکتِ ساسان کے درباروں میں، ہر بادشاہ کے زمانے میں، ہر سال دُہرایا جاتا تھا۔

''اپنے سے کم تر لوگوں کی حالت پر غور کرو۔'' چوبدار نے کہا اور دوسرے چوبدار نے اسے گونج کی طرح دُہرایا۔ ''غور کرو، تو اپنے رتبے کو غنیمت پاؤ گے۔ جو نچلے درجے کے ہیں وہ یہ دیکھ کر شاکر ہو جائیں کہ وہ ان سے بہتر ہیں جو موردِ ملامت ہوئے۔ اور جو موردِ ملامت ہوئے وہ انھیں دیکھیں جن کو سزائیں ملی ہیں۔ اور جن کو سزائیں ملی ہیں وہ...''

شاہی چوبدار صدیوں کا رٹا پٹا سبق دُہرا رہا تھا اور دوسرا چوبدار اسے جوں کا توں پیچھے بیٹھنے والوں کو سُنا رہا تھا۔

یہ طیسیفون تھا، سلطنتِ ساسانیہ کا پایۂ تخت۔

یہ پانچویں صدی عیسوی کی بات ہے۔

یہ سلطنتِ آریان کا شاہی محل تھا۔ اس کے وسیع و عریض دربار کی دیواریں حریر و پرنیاں

سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس کی دیواروں پر بلور کی پچّی کاری تھی اور یاقوت و زمرد جڑے تھے۔ اس کا فرش دبیز ترین ریشمی قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی ہر کرسی میں رتبے کی مناسبت سے ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے اور ان پر منصب دارانِ سلطنت متمکن تھے۔ فرمان سننے کے ساتھ ان کی گردنیں مڑ گئی تھیں اور وہ حکم کے مطابق اپنے سے کم تر منصب داروں اور طبقوں کو بغیر پلک جھپکائے دیکھنے لگے تھے۔

ایوان کی مغربی دیوار کے سامنے سونے کے ایک تخت پر بادشاہ قباد اپنی آرام دہ سرخ بانات کی مرصع کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا جسم زریں قبا اور زیورات کی کثرت سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سر پر ہیروں اور یاقوتوں سے مزین تاج رکھا تھا۔ اس سارے کروفر کے باوجود اس کے چہرے پر پریشانی کا خفیف سا تاثر واضح تھا۔

اس کے بعد شاہزادگان کی قطار تھی۔ شہنشاہ قباد کے بیٹے، کاوس، جس کی ابھی مسیں بھیگی تھیں، اس سے چھوٹا شہزادہ خسرو، جس کی بانکی چتون سے اس چھوٹی عمر میں بھی ذہانت ٹپک رہی تھی اور پھر زم، جس کی ایک آنکھ نہیں تھی، ہوسکتا ہے کہ یہ کارستانی کسی سوتیلی ماں کی ہو، کیونکہ ایسا شخص سلطنت کا وارث نہیں بن سکتا تھا جس کے جسم میں کوئی نی ہو۔ اس کے بعد صوبوں کے شہرداران تھے جو لقب کے موجب شاہان تھے، پھر واسپہران تھے، جو سلطنت کے سات ممتاز ترین خاندان تھے، جن کے ذمے شہنشاہ کو تاج پہنانے جیسے اہم کام تھے۔ پھر مملکت کے بڑے رئیسوں اور جاگیرداروں کی کرسیاں تھیں جو وزرگان (امراء) کہلاتے تھے۔ ان میں ہی موبدان شامل تھے، مملکت کے روحانی پیشوا، جو قضاوت بھی کرتے تھے اور جن کے اپنے طبقات تھے۔ پھر آزادان تھے جو موروثی نجیب تھے۔ ان میں موروثی سپہ سالارانِ مملکت بھی شامل تھے۔ پھر دہقانان تھے جو کسان نہیں تھے بلکہ زرعی زمینوں کے مالک تھے اور کاشتکاروں سے لگان وصول کرتے تھے اور اسی طرح یہ کرسیوں کی قطاریں منصب داروں کے ساتھ ختم ہو جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ کرسیوں کے بعد قالینوں پر مودب بیٹھے ہوئے عامیوں کا ہجوم تھا۔ ان میں کسان، کاریگر، معمولی دوکاندار بلکہ اس خاص تقریب کے لیے حراست خانوں اور عقوبت خانوں سے بلوائے گئے مجرم بھی موجود تھے۔ اس ساسانی دربار میں ایک تنکا بھی جگہ سے بے جگہ نہ تھا۔ یہ ایک مکمل منصبی اور طبقاتی تقسیم تھی۔

چوبدار نے نقارے پر چوٹ لگا کر کہا: ”نگاہ روبرو!“

اب درباریوں نے پھر گردنیں پھیریں۔ چوبداروں نے صدیوں پرانا فرمان جاری رکھا: ”خبردار! ہرگز کوئی شخص اپنے رتبے سے بلند تر رتبے کا خواہاں نہ ہو جو اس کو پیدائشی طور پر یعنی

ازروئے نسب حاصل ہے...''

آتش کدوں کے نگہبانوں کی صف میں ایک جڑاؤ کرسی پر بیٹھے ایک موبد نے بہ مشکل اپنے آپ کومسکرانے سے روکا، حالانکہ یہ ایک استہزائیہ اورملول مسکراہٹ ہی ہوتی۔

''ازروئے نسب!'' وہ سوچ رہا تھا۔''جس طرح عامیوں کی عورتوں کو دن رات یہ روسا اٹھا لے جاتے ہیں تو کتنے ہی نسبی شہزادگان اور وزرگان تو کسانوں کی جھونپڑیوں میں کھیل رہے ہیں۔ اور ان کی عورتیں — جو کسانوں کے کسے کسائے جسموں پر فریفتہ رہتی ہیں۔ کیا کوئی سچ مچ بتا سکتا ہے کہ کتنے کسانوں کے بیجوں کا پھل ان محلّات کے باغوں میں جوانی کا رس پکڑ رہا ہے!''

اس نے اپنے زردوزی کے جوتوں کوغور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ سوچ رہا تھا:''یہ ایک ایسا راز ہے جو اس دربار میں بیٹھا یا کھڑا ہوا ہر شخص جانتا ہے اور کوئی لب پر لانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اف! اس قدر جھوٹ! اس قدر دھوکا دہی!'' اس کا خون کھولنے لگا۔''اور یزداں کی گردان! اور اَوِستا کی تکرار! ان سب کی تہہ میں صرف لالچ، ہوس، بے پایاں ہوس! ہاں! بس اب یہی کچھ باقی بچا ہے۔''

چوبدار اب پندنامہ پڑھ رہا ہے۔

''قناعت کرو، اے عظیم الشان مملکتِ آریان کے فرزندو۔ قناعت بڑی چیز دنیا میں ہے۔ قناعت سے بڑھ کر نہیں کوئی شے۔ اہورامزدا نے فرمایا... دل کا سکون صبر وشکر... فلاں فلاں فلاں۔''

''اہورامزدا! اہورامزدا نے کیا فرمایا تھا اوخبیث! تجھے یاد بھی ہے؟ کیا تو نے اَوِستا کا ایک لفظ، ایک سطر بھی سمجھی ہے۔نہیں! وہ کسی کو یاد تک نہیں۔ ہاں مانی اسے سمجھتا تھا۔ بدنصیب مانی! جس نے گمراہوں کے اس غول کو راستہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔لیکن اسے زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ اسے موبدوں نے قتل کر دیا... آہ! مانی! جو ایک فنکار تھا... برف کے گالے کی طرح پاک وصاف تھا وہ۔ جو اپنے موقلم سے کاغذ پر رنگ بکھیرتا تو درخت، پھول، پھل، پرندے اور انسان گویا کاغذ پر جی اٹھتے۔ اور اس کا خط! آہ کس قدر پاکیزہ خط تھا۔''

اس کے باپ بامداد کے پاس مانی کی کچھ تحریریں محفوظ تھیں، جن کو اس نے صرف اپنے بیٹے کو دکھایا تھا۔ یا جو کچھ اسے زبانی یاد تھا وہ اسے رات کے اندھیرے میں سنا دیا کرتا تھا۔ مانی کے قتل کے بعد اس کی اُمّت روپوش ہوگئی تھی۔ کچھ لوگ ایران چھوڑ کر چلے گئے تھے اور چند ایک نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو زندہ تو ضرور رکھیں گے لیکن کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے دیں گے۔ نسل بعد نسل وہ اس خاموشی پر قائم رہے تھے۔ بامداد بھی ان میں سے ہی ایک

تھا۔ سینہ بہ سینہ اس نے اپنا راز اپنے فرزند کے سپرد کیا تھا۔ لیکن اب وہ خوفزدہ تھا کیونکہ اس کا یہ بہت ذہین اور حساس بیٹا خاموشی کا قائل نہیں تھا۔ وہ ایک باغی تھا۔ وہ بھی مانی کے اقوال سے محبت کرتا تھا۔ لیکن بامداد کانپ جاتا جب وہ اس سے سرگوشی میں کہتا: ''یہ سب درست، لیکن اے میرے بزرگ باپ، میدانِ عمل میں ہمیں بزرگ پیغمبر مانی کے راستے پر نہیں چلنا، کچھ دوسری ترکیبیں اختیار کرنی ہیں۔''

یہ مزداد تھا۔ ایک معزز موبد، اسے اَوِستا زبانی یاد تھی۔ یاد کرنا کیا معنی، اس کا ایک ایک نسک اس کے دل کے نہاں خانوں میں محفوظ تھا اور جو کچھ وہ اپنے گرد و پیش میں دیکھ رہا تھا وہ اُس اَوِستا کے برخلاف تھا جسے اس نے سمجھا تھا۔

گرد و پیش... قطاروں میں دربار سے باہر نکلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ گرد و پیش میں کچھ بھی پہلے جیسا نہ تھا۔ آریان کی یہ سلطنت جس کا اور چھور نہ تھا جو اعرابی جزیروں سے ارمنوں کے ملک تک پھیلی تھی اور جس میں ہر بادشاہ نے مقدور بھر اضافہ کیا تھا، جس کی ہیبت سے سلطنتِ روما لرزہ براندام رہتی تھی کیونکہ ساسان کی افواجِ قاہرہ نے اسے بارہا شکست دی تھی۔

مگر مزدک کو ان فتوحات اور شکستوں کی زیادہ پروا نہ تھی۔ یہ آریاؤں کی سلطنت، جو اس کے ذہن میں شاید ازل سے چلی آ رہی تھی، جب سے جیومرث پیدا ہوا، جو روئے زمین کا اولین انسان تھا، تب سے یہ سلطنت کبھی گھٹتی اور کبھی بڑھتی رہتی تھی۔ اصل سوال تو اس کی نظر میں یہ تھا کہ سلطنت، چھوٹی ہو یا بڑی، چل کیسے رہی ہے۔

مغرب میں رومیوں کی سلطنت تھی۔ آریان سے بڑھ کر عظیم الشان! لیکن ان کا بھی یہی حال تھا۔ یوں ان کے چھوٹے بڑے حکمرانوں کو آریان کے علاقوں پر حملے کرنے اور انھیں اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ آریوں نے ان کی کئی دفعہ اچھی طرح ٹھکائی بھی کی تھی۔ وہ اپنی ہزاروں نعشیں جنگ کے میدانوں میں چھوڑ کر بھاگے تھے۔ پھر آریوں نے ان کی سلطنت پر حملے کیے تھے اور ان کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔

اس شدید دشمنی نے جنم دیا تھا دوستیوں کو۔ رومی بادشاہ اور منصب دار کئی آریہ بادشاہوں اور منصب داروں کے دوست بن گئے تھے اور ایک دوسرے کی بیٹیوں سے بخوشی شادیاں رچاتے رہتے تھے۔

یوں اگر کسی شخص یا گروہ پر شہنشاہِ آریانان کا عتاب نازل ہوتو جلاوطنی کے لیے رومی سلطنت سے بہتر دوسری جگہ نہ تھی۔ بہت عرصہ پہلے، کوئی دو صدیاں بیتی تھیں، جب ایک ایرانی باغی، جس کا

نام پیغمبرِ اعلیٰ کے نام پر زرتشت اس کے ماں باپ نے رکھ دیا تھا، جلاوطن ہوکر رومی سلطنت ہی گیا تھا۔ وہ شاہی خاندان کا تھا اور سلطنتِ روما میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا کیونکہ نسب کے، رومی بھی آریان سے کچھ کم قائل نہ تھے۔ وہاں اسے ''بندوس'' کے نام سے پکارا جانے لگا تھا کیونکہ رومیوں کی زبان ایرانی ناموں پر مڑتی نہ تھی اور وہ انھیں بگاڑ کر اپنے ناموں جیسا ہی بنا لیتے تھے۔ پھر اس کا نام ہی بندوس پڑ گیا تھا۔

کہتے ہیں بندوس ایران واپس بھی آیا تھا۔ لیکن پھر اس کے ساتھ کیا ہوا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

کیا کہتا تھا یہ بندوس؟ شاید یہ کہ مملکتِ آریان کے سب وسائل، کھانا پانی، سونا چاندی، ان سب پر تمام آریاؤں کا برابر کا حق ہے۔ غریب اور امراء کا فرق مٹا دو! یہ ایسے خطرناک نظریات تھے کہ جن کے اظہار کے بعد اس پر بادشاہ اور منصب داروں کا عتاب لازمی تھا۔ رومی سلطنت کے حاکموں نے پہلے تو اسے سلطنتِ آریان کے مضبوط قلعوں کی دیواروں میں رخنہ ڈالنے والے باغی کی حیثیت سے خوش آمدید کہا تھا۔ لیکن بعد میں شاید انھی خطرناک خیالات کی وجہ سے اسے ایران واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ مملکتِ آریان کے تخت و تاج کا نہیں، ایک پورے معاشی اور معاشرتی نظام کا باغی تھا۔ یہ نظام تو خود ان کا اپنا سہارا تھا۔ اس لیے انھوں نے اسے واپس رخصت کر دیا تھا۔ ''الوداع! اے معزز مہمان۔ آپ اپنی تبلیغ کہیں اور جا کر کیجیے۔'' انھوں نے کہا تھا۔ زرتشت کے نظریات ''سب کا حق برابر اور غریبوں اور امراء کی تفریق مٹا دو'' میں حیرت انگیز مقبولیت کے بیج پوشیدہ تھے۔ یہ تباہی، بربادی اور سلطنتیں ڈھانے کا نسخہ تھا۔ وہ امید کرتے تھے کہ زمینِ آریان پر یہ خیال مقبول ہو جائیں گے اور آریانان کی شان و شوکت کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔ پھر وہ زمینِ آریان کو آسانی سے فتح کر لیں گے اور یہ کج کلاہ اور مغرور آریان، رومی منصب داروں کے جوتے صاف کریں گے اور ان کے محلات کے فرش رگڑ رگڑ کر چمکائیں گے۔

گرد و پیش...

مزدک نے لمبی سانس لے کر چوبدار کے الفاظ یاد کیے۔ شہنشاہ کے عظیم الشان، باجبروت محل کے دروازے سے نکلتے ہی گرد و پیش سامنے تھا۔ اس کا دو گھوڑوں والا رتھ ویرانوں سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف بھیانک قحط پھیلا تھا۔ بارش تو ان علاقوں میں یوں بھی کم ہوتی تھی، لیکن صدیوں سے محنت کشوں نے دریاؤں سے نکالی ہوئی نہروں کا جال ہر طرف بچھا دیا تھا جس سے فصلیں پورے سال سیراب ہوتی تھیں۔ یہ دریا سوکھے پڑے تھے۔ کھڑی فصلیں جل گئی تھیں۔ کسانوں کے پاس کھانے کے لیے اناج کا دانہ تک نہ تھا۔ عوام بھوک سے مر رہے تھے۔ بلاشبہ امراء اور شہزادگان اور

معبدوں کے گودام غلّے سے اٹا اٹ بھرے تھے لیکن ان کی ایک کھیل بھی اُڑ کر غریب کسانوں کے منھ میں نہیں جا سکتی تھی۔ بلکہ شہنشاہ قباد نے جب یہ عندیہ دیا کہ شاہی گوداموں سے اناج کسانوں تک پہنچایا جائے اور امراء بھی اس میں اپنا حصّہ ڈالیں تو منصب داران کا مزاج بگڑنے لگا تھا۔ موبدوں نے دبی زبان سے اور واضح تیوروں سے برہمی کا اظہار کیا تھا۔ قباد بے شک شہنشاہ تھا لیکن شہنشاہ گر تو موبد اور وزرگان تھے۔ شہنشاہ نے اصرار کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ مخمصے میں تھا۔

اچانک کشادہ راستے پر بھوکے کسان مردوں اور عورتوں کا غول نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گیا۔ ان کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے، ہڈی سے چمڑا لگا ہوا تھا، آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے سیاہ حلقے، خشک ہونٹ، وہ بھوت پریتوں کے غول کی طرح بانہیں پھیلائے، خوشامدانہ الفاظ دُہراتے مزداد کی رتھ کی طرف لپک رہے تھے۔

''خیرات! خیرات! پیشوا!! ہم بھوکے ہیں مالک! ہم پیاسے ہیں!!''

''تیز... رتھ کو اور تیز چلاؤ۔ یہاں سے دور نکل چلو۔''

مزدک نے رتھ بان سے جھڑک کر کہا۔ رتھ بان نے گھوڑوں کو چابک رسید کیے، ان کی لگاموں کو مستعدی سے جنبش دی۔ گھوڑے سرپٹ بھاگنے لگے۔ ہچکولے کھاتا رتھ تیزی سے بہت آگے نکل گیا۔ بھوکوں ننگوں کا غول پیچھے رہ گیا۔

مزداد منھ پھیرے رتھ میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، صرف جلن تھی، جیسے پتلیوں کے پیچھے آگ لگی ہو۔ ذہن میں ایک چکّی سی چل رہی تھی۔ اَوِستا کی سطریں...

''اور وہ جو دونوں بازوؤں سے زمین کو کاشت کرتے ہیں، ان سے زیادہ مبارک اور سعید ہستیاں روئے زمین پر نہیں۔ سلامتی ہو ان پر، اور خوشی ان کے گھروں کو بھر دے۔ معزز ترین، عظیم ترین، مبارک ترین ہیں وہ جو غلہ بوتے ہیں، اسے سینچتے ہیں اور اسے کاٹتے ہیں۔ تاریکی اور غم ان کے گھروں سے دور رہیں گے۔ ان کے گھر ہمیشہ روشنی سے معمور... اور وہ اہورا مزدا کی تخلیق کے منصوبے کو پورا کرتے ہیں اور جب جَو کی بالیاں پکتی ہیں تو اہرمن کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور جب دانے ان کے گھروں میں آتے ہیں تو ارواحِ بد زار و قطار روتی ہیں اور جب اناج پیسا جاتا ہے تو تاریکی اور بدی اور اہرمن ان کے گھروں سے سرپٹ بھاگ نکلتے ہیں کیونکہ اناج اور آٹا ان کی موت ہے۔''

''اور یہ ہیں مبارک ہستیاں!'' مزداد نے تلخی سے زیرِ لب کہا۔ ''نہیں نہیں اے خدائے آسمان و زمین! اے فردوسِ بریں اور دوزخ و برزخ کے خدا... تیرا یزداں ہار رہا ہے اور

اہرمن جیت رہا ہے۔ تاریکی جیت رہی ہے، بدی جیت رہی ہے۔ اور یہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔''

''اور اے خدا کے نیک بندے! لالچ مت کرو، غصہ مت کرو، اور تم میں سے ہر ایک صرف اپنی محنت سے پیدا کیے ہوئے روزگار سے اپنا پیٹ بھرے گا اور اعتدال سے کھائے گا۔''

مزدک کو اَوِستا کی سطریں یاد آ رہی تھیں۔

''اپنی محنت سے! اپنی محنت؟'' اس کے دل میں کوئی طنز سے ہنس رہا تھا۔ ''آج اس مملکت کے پایۂ تخت میں اتنا اناج موجود ہے کہ اس کا ایک ایک شہری سال بھر تک پیٹ بھر کے کھا سکتا ہے۔ مگر وہ سب کہاں ہے؟ امراء اور موبدوں کے گوداموں میں بند ہے۔ اس میں سے بہت کچھ شاید سڑ بھی جائے، یا وہ اسے رومنوں کے ہاتھ بیچ دیں گے۔ اور انھوں نے پوری زندگی محنت نہیں کی ہے۔ یہ موبد اور یہ امراء محنت کے معنی سے ناواقف ہیں۔ یہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے صرف عیش کرتے ہیں۔ ان کی بڑی سے بڑی کلفت شکار پر جانا ہے، جس میں جانور بھی غریب کسان اور چرواہے گھیر کر لاتے ہیں تاکہ یہ اُنھیں آرام سے مار کر اپنے شکار کا شوق پورا کریں۔ اور اعتدال! ان کے رومن ساتھیوں کی پُرخوری کی داستانیں کہاں تک مشہور ہیں۔ وہ اتنا زیادہ کھاتے ہیں کہ پیٹ پھٹنے لگے اور پھر قے کرتے ہیں تاکہ پیٹ خالی ہو سکے اور دوبارہ لذیذ ترین طعام کھانے لگتے ہیں۔ وہ غلیظ ہیں، اور یہ وزرگان بھی، اور یہ پورے دریا سے دن رات نہاتے رہیں تب بھی پاک نہیں ہو سکتے۔''

''اف! اتنی تلخی مجھ میں کہاں سے آ گئی!'' مزداد خوفزدہ ہو کر سوچ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اتنا تلخ نہ تھا۔ وہ ایک پاکیزہ زرتشتی کی طرح ''خوش خیال، خوش گفتار اور خوش کردار'' تھا، جیسا کہ اہورامزدا کا فرمان تھا۔ لیکن کچھ عرصے پہلے، قحط کے آغاز میں جب وہ آتش کدے سے باہر نکل رہا تھا تب دروازے پر اسے ایک پریشان حال کسان ملا تھا جس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کئی دن کے فاقے سے ہے۔ اس کی گود میں ایک تین چار برس کا بچہ تھا۔ وہ بالکل خاموش کسی بت کی طرح کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے کرشان؟'' مزدک نے پوچھا۔

''میرا بچّہ!'' اس نے کہا۔ ''اس کو کئی دن سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ دیکھیے اسے کیا ہو گیا۔''

مزداد نے بچّے کے خوبصورت چہرے سے الجھے ہوئے بال ہٹا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بچے کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔ اس کے سوکھے ہوئے گلابی ہونٹ اب بھی بسور رہے تھے۔ بند آنکھوں کی سیاہ پلکوں کی صف بچکانہ رخساروں پر ساکت تھی۔ بچے کو مرے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

''آپ اسے ٹھیک کر دیجیے مہربان آقا! آپ تو طبیب بھی ہیں۔'' کسان نے کہا۔
''تم اناج مانگنے... پہلے کیوں نہ آئے۔'' مزداد نے تھوک نگل کر مشکل سے کہا۔
''آپ اس آتش کدے کا تمام غلّہ پہلے ہی کرشانوں میں بانٹ چکے تھے۔'' کسان نے مایوسی سے کہا۔

''میں اس کو اپنے گھر سے...''

مزداد نے بے اختیار کہنا شروع کیا، اور پھر ایک دم رک گیا۔ اس کے بشرے سے مایوسی ٹپکنے لگی۔ یہ سب کسی قدر لا حاصل تھا!! وہ اپنے گھر کے اناج سے کس کس کا پیٹ بھر سکتا تھا؟ وہ اپنے لیے زیادہ نذرانے کا حصّہ یوں بھی نہ لیتا تھا۔ بس اس قدر کہ گھر والوں کے لیے کافی ہو سکے۔ وہ خوراک جمع کرنے والوں میں نہ تھا۔ آخر اس نے نظریں اٹھائیں اور کہا:

''کرشان، تمھارا بچہ مر چکا ہے... اسے... اسے دفن کر دو۔''

غریب غربا اپنے بچوں کو دخمے (زرتشتیوں کا تابوت) پر نہ رکھتے تھے۔ مرگ کی رسومات کی اجرت اور نذرانوں کی ان کی استطاعت نہ تھی۔ وہ اپنے بیل کے پیشاب سے پاک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں بھی بہت خرچ ہوتا تھا۔ موت بہت اصراف کرانے والا وقوعہ تھا۔ غرباء اس کے لیے قرض لیتے تھے اور برسوں قرض کے چکر سے نجات حاصل نہ کر سکتے تھے۔ امراء کے لیے یہ اپنی دولت اور حیثیت کی نمائش کا شاندار موقع ہوتا تھا۔ لیکن غریب کسان؟ اور وہ بھی قحط میں؟ مزداد کو توقع تھی کہ کسان چیخیں مار مار کر روئے گا۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ گریہ وشیون کا عادی ہو چکا تھا۔ جو غربا کے علاقوں سے اٹھتے رہتے تھے۔ لیکن اس کسان کا ردِّعمل غیر متوقع تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے مزدک کو دیکھتا رہا پھر ہنسا پھر آہستہ سے کہنے لگا:

''نہیں، نہیں، دیکھیے تو... زندہ ہے... یہ دیکھیے۔''

اس نے بچّے کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے کھولیں اور مزداد کو اس کی ساکت، بھوری پتلیاں دکھانے لگا۔ پھر اس نے بچّے کا ننھا سا منھ کھول کر دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے سفید، چمکیلے دانتوں کی قطار کو دیکھا اور خوشی سے چہکنے لگا۔

''زندہ ہے، زندہ ہے، ذرا دیکھیے — مگر ہِل جُل نہیں رہا۔''

فاقہ زدہ باپ کی حالت دیکھ کر سچ تو یہ ہے کہ نیزے اٹھائے آتش کدے کے سنگدل پہرے دار تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ وہ آبدیدہ ہو گئے۔ انھوں نے نظریں جھکا لیں۔
مزداد ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔ بچّے کی لاش کو فوراً ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ کیا یہ کسان اپنی

موجودہ دماغی حالت کے ساتھ اسے دفن کر سکے گا؟ یقیناً نہیں۔ یہاں دوسرا کون تھا جو اسے ہاتھ لگاتا! لاش پلید ہوتی ہے۔ جب روح جسم کو چھوڑ دے تو جسم قطعی پلید ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سے کافی جلد بُو آنے لگتی ہے۔ اس کو صرف لاش اٹھانے والی پلید قوم ہاتھ لگا سکتی ہے جس کے بعد ان تک کو پاکی کے پیچیدہ غسل کرنے لازم تھے۔

مزداد نے مردہ بچّے اور ہنستے، مسکراتے باپ کو دیکھا۔ پھر مزداد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ زور زور سے رو رہا تھا اور اس کا توانا جسم ہچکیوں سے جھٹکے کھا رہا تھا۔ پہریدار موبد کو اس حالت میں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ لیکن اس لمحہ ان کے دل اپنے موبد کے لیے عزت اور محبت سے بھر گئے تھے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس ایک لمحہ میں ان پر اپنے جذبات کے بالکل مخالف جذبات منکشف ہو رہے تھے۔

مزداد تھوڑی دیر تک روتا رہا۔ پھر وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ اس نے بچّے کی لاش کسان کے ہاتھوں سے نرمی سے نکالی اور تیز تیز قدموں سے کھیتوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ کسان جلدی جلدی قدم بڑھاتا اس کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ ''یہ ٹھیک ہو جائے گا... اس کو دوا دے دیجیے...'' وہ مسلسل کہے جا رہا تھا۔ کھیتوں کے آس پاس فاقے سے مرنے والے کسانوں کی اجتماعی قبریں تھیں۔ وہاں دوسرے کسان موجود تھے۔ مزدک نے لاش کو زمین پر رکھ دیا۔ کسان آنسو بہاتے ہوئے زمین کھودنے لگے۔

اس دن کے بعد مزداد بھوک سے بلکتے ہجوم کو دیکھ کر کبھی اشک بار نہیں ہوا۔

اس وقت بھی، جبکہ اس کی رتھ اس کے گھر کی طرف جا رہی تھی، اس کے ذہن میں یہ منظر ایک متحرک تصویر کی طرح آیا اور غائب ہو گیا۔ اس نے ایک لمبی سانس بھری اور خود سے وعدہ کیا: ''میں عقل وفہم سے کام لوں گا۔ عقل وفہم خیر ہے۔ جذبات میں بہہ جانا، چیخنا چلّانا، یہ سب عقل نہیں، یہ شر ہے۔ اہرمن! تو مجھ سے نہ جیت پائے گا۔''

۲

رتھ مزداد کے گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر مڑی تو اسے اپنے باغیچے کی چہار دیواری کے سامنے ایک مزین اور مرصع رتھ کھڑی نظر آئی۔ مزداد نے اسے پہچان لیا۔ ''سیاوش!'' اس نے مسرت سے زیرِ لب کہا۔ سیاوش مزداد کا دوست تھا۔ وہ شہنشاہ کی فوج کا ایک اعلیٰ سردار تھا اور شاہ قباد کا محبوب دوست بھی۔ فوج میں اس کا لقب ''ہزار پتی'' تھا کیونکہ وہ ایک ہزار سپاہیوں کا سالار تھا، لیکن وہ قباد سے بہت نزدیک تھا۔ سیاوش ایک خوش اخلاق، پرخلوص اور بہادر انسان تھا۔ اس کی خوبیوں نے قباد کا دل موہ لیا تھا۔ وہ بلا روک ٹوک اس کے محل میں آتا جاتا تھا، اس کے ساتھ مے نوشی کی نشستوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ شطرنج اور چوگان میں قباد کا شریک تھا۔ کبھی کبھی قباد اس کے ساتھ تنہا نشست آراستہ کرتا۔ اسے سیاوش پر بھروسہ تھا۔ جواں سال بادشاہ اور فوجی سالار میں ایک گہری دوستی پیدا ہو گئی تھی جس کی بنیاد باہمی پسندیدگی اور بھروسے پر تھی۔

مزداد کی سیاوش سے دوستی کی بنیاد مختلف تھی۔ کسی اتفاق سے مزداد کا باپ بامداد اور سیاوش کا باپ دونوں ایک چھوٹے سے شہر مادریا کے رہنے والے تھے اور تقریباً ایک ہی وقت میں دارالسلطنت آئے تھے۔ ان کے خاندان ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ان کے گھر میں تیار ہونے والے کھانوں کے مصالحے یکساں تھے۔ ان کا لہجہ اور مذاق ایک جیسا تھا۔ وہ یکساں محاورے استعمال کرتے تھے۔ مختلف النوع اقوام سے بھرے دارالسلطنت میں، سیاوش، مزداد سے جس خاص قسم کی اپنائیت محسوس کرتا تھا وہ کسی دوسرے کے لیے نہ کرتا تھا۔ دونوں ہم عمر تھے اور ایک دوسرے کی اچھی انسانی خصوصیات کو پسند کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر بھروسا کرتے تھے۔ کبھی کبھی، طعام کے بعد سیاوش ہنس کر کہتا:

''کچھ بھی ہو، مگر ہماری دوستی کی بنیاد محاوروں پر ہے۔''

سیاوش اسے اپنی کشادہ حویلی کے باہر ہی مل گیا۔ وہ سوکھے ہوئے باغیچے کے وسط میں سرخ اور نیلگوں پتھروں کے خوبصورت تالاب کے کنارے جھکا ہوا کھڑا تھا اور ایک ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے رنگ برنگی مچھلیوں سے کھیل رہا تھا جو کائی زدہ، بہت کم رہ جانے والے پانی میں اب پژمردہ اور ساکت تیرتی جا رہی تھیں۔ وہ باہر مزداد کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیاوش کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ

بانہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھا۔ ''خوش آمدید، خوش آمدید!'' مزداد نے خوشی سے کہا۔ دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو گرم جوشی سے گلے لگایا۔

آپس میں باتیں کرتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئے جس کے وسیع دریچے کھول دیے گئے تھے، اندر نرم دریوں پر گاؤ تکیے لگے تھے۔ چھوٹی بڑی تپائیوں پر آرائشی پیالے اور گلدان سجے تھے۔ ایک گوشے میں بڑا قالین بچھا تھا جس پر ایک وسیع مگر نیچی تپائی پر شطرنج کی بساط کھلی رکھی تھی۔ نیلے پتھر کی مستطیل چھوٹی سی صندوقچی میں سنگِ سیاہ اور مرمر کے مہرے رکھے تھے۔ تپائی کے وسط میں ایک نیلگوں کاشی کے قاب میں خشک میوے تھے۔

سیاوش اور مزداد قالین پر بیٹھ گئے اور خوش دلی سے باتیں کرنے لگے۔

''میں یاقوت دخت کو لوٹانے آیا ہوں۔'' سیاوش نے کہا۔ ''میری خادمہ لوٹ آئی ہے۔''

''اچھا!'' مزداد نے مسرت سے کہا۔ یاقوت دخت اس کی خادمہ ہی نہیں، اس کی بیوی بھی تھی، لیکن وہ اس کی ''زنِ چگاری'' تھی ایک ''خدمت گار بیوی'' جسے بوقتِ ضرورت دوستوں یا رشتے داروں کو عاریتاً دیا جا سکتا تھا۔ اس کی ''زنِ پادشائی'' یعنی اولین بیوی جو اصل بیوی شمار ہوتی تھی، دینگ تھی۔ نوعمری ہی میں بامداد نے مزداد کی شادی کر دی تھی کیونکہ مزداد کی ماں اس کے بچپن میں ہی چل بسی تھی اور بامداد کو گھر کی نگہبانی کرنے کے لیے گھر میں ایک خاتونِ خانہ کی ضرورت تھی۔ بامداد خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی اس خوب صورت بھتیجی کو، جو اب اس کی بہو تھی، جلد ہی ایک مہلک مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں سوکھتی چلی گئی تھیں اور سال بھر کے اندر وہ چلنے سے بالکل معذور ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر پڑی حسرت بھری نظروں سے ٹکر ٹکر اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی۔ رفتہ رفتہ اس نے بولنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بامداد اس کو اپنے خاندان کی ایک بڑی بدقسمتی سمجھتا تھا، خدائے پاک کی طرف سے ایک آزمائش جس میں وہ اور اس کا بیٹا دونوں پورے اترے تھے، کیونکہ مزداد نے دینگ کو طلاق نہیں دی تھی۔ وہ اپنی بیمار اور معذور بیوی سے محبت اور مہربانی سے پیش آتا تھا اور اکثر اپنے ہاتھ سے کھانے کا خوان اٹھا کر اس کے بستر تک لے جاتا تھا۔ مزداد کے پاس دو تین زنِ چگاریاں تھیں لیکن یاقوت دخت کی بات سب سے الگ تھی۔ وہ کسان کی بیٹی تھی، محنتی اور مشقت کش حسین نوجوان عورت۔ وہ ذہین اور حاضر جواب تھی اور اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ مزداد اس دیہاتی حسینہ کے لیے اپنے دل میں شفقت اور محبت محسوس کرتا تھا۔ اکثر وہ اس کے ساتھ ہی سوتا، یا باغیچے میں وقت گزارتا جہاں پودوں کو پانی دیتے ہوئے وہ مزداد کو اپنے دلربا دیہاتی گیت سناتی۔ اسے یاقوت دخت کو خود سے جدا کرتے ہوئے دکھ ہوا تھا لیکن جب سیاوش نے اس

سے چند دنوں کے لیے یاقوت دخت کو طلب کیا، کیونکہ اس کی خادمہ زچگی کے لیے گاؤں چلی گئی تھی، تو وہ انکار نہیں کر سکا تھا۔ وہ سیاوش کو یاقوت دخت سے کم تو نہ چاہتا تھا اور ایک رائج اور تسلیم شدہ رسم پر انسان غیرت اور حسد محسوس نہیں کرتا۔

''ہاں! یہ تمھارے لیے اچھی رہے گی۔ یہ اچھی ہے۔'' اس نے سیاوش کے شانے کو تھپتھپا کر کہا تھا۔

''مگر تم...'' سیاوش نے تذبذب سے کہا تھا۔

''ارے نہیں دوست!'' مزداد نے کہا تھا۔ ''یہ میری ملکیت نہیں۔'' پھر اس نے سوچتے ہوئے کہا تھا، ''عورت کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوتی۔'' اس نے سیاوش کو غور سے دیکھا تھا پھر دریچے سے جھانکنے لگا تھا۔ ''ملکیت! یہ لفظ ہی بے معنی ہے۔ کیسی ملکیت؟ تم نے تختِ جمشید کا قلعہ دیکھا ہے؟ اب تو وہ بھی کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ ملکیت موجود ہے... مگر مالک...؟ وہ اس طرح غائب ہو چکا ہے جیسے ہوا میں سوکھے پتے غائب ہو جاتے ہیں۔'' سیاوش ہنس پڑا تھا۔ اسے اپنے فلسفی دوست کی باتیں اچھی لگتی تھیں جو شاعروں کی طرح تھیں اور شاعری ہر ایرانی کو محبوب تھی۔ وہ خوش دلی سے یاقوت دخت کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ مزداد کو اس کی کمی محسوس ہوئی تھی خصوصاً رات کو وہ اسے یاد آتی تھی لیکن پھر ملک کو قحط نے آ لیا تھا اور مزداد کے سارے وجود کو کسانوں کی فاقہ کشی اور پے در پے اموات نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ پھر بھی وہ خوشی محسوس کر رہا تھا کہ یاقوت دخت واپس آ گئی تھی۔

''کہاں ہے وہ؟'' مزداد نے مسرت سے پوچھا۔

''زنان خانے میں...'' سیاوش نے کہا۔ ''وہ بانوئے کدخدا کے پاس ہے اور ان کی خدمت کر رہی ہے۔ میں انھیں اور تمھارے پدرِ بزرگوار کو آداب کر کے آیا ہوں۔'' سیاوش نے پستے کے کچھ دانے منھ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے اپنے گھر کا وہ خاص شربتِ گلاب پلاؤ، جیسا مادریا میں بنایا جاتا ہے۔ پھر میں چلتا ہوں۔''

''نہیں نہیں!'' مزداد نے کہا۔ ''تم کھانا کھائے بغیر کیسے جا سکتے ہو۔ میں دستر خوان چننے کے لیے کہتا ہوں۔'' اس نے زور سے تالی بجائی۔ ایک خادم حاضر ہوا اور کھانا لگانے کا حکم سن کر واپس چلا گیا۔

''کھانا! بخوشی!'' سیاوش نے مسکرا کر کہا۔ ''تمھارے گھر جیسا کھانا... وہ بھی تو مجھے شہر بھر میں کہیں اور نہ ملے گا۔''

وہ مزداد کے گھر کا کھانا رغبت سے کھاتا تھا حالانکہ اسے یہاں گوشت نہیں ملتا تھا۔ موبدوں کو

گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ موبد صرف سال بھر کا اناج اپنے گھر میں رکھ سکتے تھے۔ اسی طرح وہ کپڑے بھی اتنے ہی بنا سکتے تھے جو سال بھر کے لیے کافی ہوں۔ مزداد ان حالات سے مطمئن تھا۔ وہ نہ گوشت کھانا پسند کرتا تھا اور نہ اسے کپڑوں کا شوق تھا۔ وہ ان موبدوں میں نہ تھا جو اپنی متعدد حویلیوں کے گوداموں میں اناج بھرے رکھتے تھے اور ریشم و کمخواب کے لباس بنواتے تھے۔ بے شک وہ اپنے آتش کدوں میں سادہ عبا میں آتے ہوں لیکن ان کی شامیں اور راتیں وزرگان اور امراء کے محلات میں گزرتی تھیں جہاں ان کے زرق برق چغے امراء کے بیش قیمت لبادوں سے کچھ کم نہ ہوتے تھے۔

سیاوش اور مزداد باتیں کرنے لگے۔

''تب تک کیوں نہ شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔''

سیاوش نے کہا: ''پچھلی بار تم نے میرے شاہ کو شکست دے دی تھی۔ میں حساب چکا دوں گا آج۔''

''شاہ!'' مزداد نے اچانک کہا۔ ''سیاوش، تمھارے شاہ کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔''

''کیا کہتے ہو!'' سیاوش نے چونک کر پوچھا۔ ''کون شاہ؟''

''شہنشاہ قباد۔'' مزداد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وزرگان اور دبیران نے اس کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تمھیں کیسے معلوم؟'' سیاوش نے پریشانی سے کہا۔

''پچھلے ہفتے، میں فرجام کی جاگیر پر ایک شادی کی رسوم ادا کرنے گیا تھا۔ بعد میں رات کے کھانے کے بعد پائیں باغ میں کچھ چنیدہ وزرگان جمع تھے۔ کئی موبدانِ اعلیٰ بھی موجود تھے اور فوجی سالار بھی تھے۔ اس محفل میں مجھے بھی شریک کیا گیا تھا۔ وہاں یہی تذکرہ تھا۔''

''تمھارے سامنے؟''

''مجھ پر کسی کو شک نہیں۔ میں بھی تو موبد ہوں۔ تمام موبد اُن کے ساتھ ہیں۔ ہمیشہ کی طرح۔ وہ ایسے خچر ہیں جن کی راسیں وزرگان کے ہاتھوں میں رہتی ہیں۔''

''اور وہ کسے شہنشاہ بنانا چاہتے ہیں؟'' سیاوش نے تیزی سے پوچھا۔

''زرمہر کو...''

''زرمہر!'' سیاوش نے الٹی سانس لی۔ زرمہر امرائے مقتدر میں اولین مقام پر تھا، ایک خطرناک حریص آدمی جو اپنی لا انتہا جاگیروں پر کسانوں کی کھال کھنچواتا تھا۔ وہ قیمتی دیبا

دوکانداروں سے چھین لیتا تھا اور اسے روم و عرب میں فروخت کرتا تھا۔ اس کی زبردستی اور ہوس سے ایرانی ریشم کی تجارت کو مستقل نقصان پہنچ رہا تھا۔

سیاوش کا دل قباد کے لیے تڑپ اٹھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا، اس کی پیشانی پر فکرمندی اور غصّے کے تاثرات نمایاں تھے۔

''مگر... زرمہر؟'' اس نے زیرِلب کہا۔

''انھوں نے اشکانی نسل کا ایک لڑکا بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ صوبہ باختریا میں ہے۔ ہے تو ابھی بچّہ... پندرہ یا سولہ برس کا ہوگا۔ منصوبہ یہ ہے کہ اسے تخت پر بٹھا دیں گے جبکہ عنانِ حکومت اصل میں زرمہر کے ہاتھ میں ہوگی۔''

''فلاں!'' سیاوش نے دانت پیس کر گالی دی۔

''یہ مت کرو سیاوش!'' مزداد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''فہم و دانش سے کام لو۔ لو اب کھانا کھاؤ۔'' دسترخوان پر کھانا چن دیا گیا تھا۔ بامداد ان کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ کمرے کے ماحول میں جو تناؤ تھا اس نے اسے بے چین اور پژمردہ کر دیا تھا۔

سیاوش مزداد کے گھر کے طعام کو بہت پسند کرتا تھا۔ آج خصوصاً اس کے لیے ''دہقانی کھانا'' تیار کیا گیا تھا جو پالک، سرکے اور آٹے سے تیار ہوتا تھا اور سبزیاں جنھیں انار کے رس میں ڈبو کر پکایا جاتا تھا۔ لیکن یہ سب آج کسی کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے جلد ہاتھ کھینچ لیا۔

''میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ بامداد کو جھک کر آداب کر کے اور اس سے دعائیں لے کر وہ رخصت ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے مڑ کر مزداد کی طرف دیکھا۔

''ہم جلد پھر ملیں گے دوست۔ تم مجھ سے وفا کرو گے نا؟''

''ہمیشہ! میں ایک سچا موبد ہوں۔''

''ہاں!'' سیاوش پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا، ''مگر آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم ہزبد ہوتے۔ میری طرح فوج کے رسالدار۔''

۳

بہت دنوں بعد یاقوت دخت کے ساتھ۔ تنہائی اور خوشبو۔

''تم کیسی رہیں؟''

''میں اچھی رہی۔''

''سیاوش کیسا نکلا؟''

''اچھا۔''

مزدک کروٹ لے کر کہنی کے بل بستر سے تھوڑا سا اٹھ کر ہنسا۔

''تم سے کس نے کہا کہ ہمیشہ سچ بولو؟''

''آپ نے!''

''نہیں۔ اس وقت سچ کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ ایسی بات کہتیں جو مجھے خوش کر دے...''

اس نے کہا اور یاقوت دخت کے ابرو اور لبوں پر انگشت پھیرنے لگا جیسے انھیں عورت کے چہرے پر خود بنا رہا ہو۔

''کیا آپ خوش نہیں؟''

''میں خوش ہوں — آج ہم یونانی طریقے سے پیار کریں گے۔''

یاقوت دخت مسکرائی اس کے دانتوں کی لڑی گلابی ہونٹوں میں چمکنے لگی۔

اچانک مزداد کو کسان کے مردہ بچے کے کھلے ہوئے ہونٹ یاد آئے۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اَن گنت فاقہ کش کسانوں کے لاشے گرنے لگے۔ اس نے بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں لیکن وہ منظر غائب نہیں ہوا۔ اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ بستر پر گر پڑے۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش چھت کو تکتا رہا۔

''آج نہیں۔''

اس نے نرمی سے کہا۔

یاقوت دخت کچھ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔

اس نے کہا: ''اچھا۔''

مزداد پیر میں جوتا ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ کمروں کے گرد نیم دائرے میں بنے ہوئے برآمدے کے ستون کے ساتھ بامداد کھڑا تھا۔ پیلی چاندنی اس کے سپید لباس اور داڑھی پر منعکس ہو رہی تھی۔

''اس وقت کہاں جا رہا ہے میرے بچے؟'' اس نے اپنی بوڑھی، لرزتی آواز میں پوچھا۔

''کہیں نہیں بابا!'' مزداد نے کہا۔ ''یہیں، پائیں باغ تک۔''

بامداد تھکے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ مزداد۔ مزدا کا عطا کیا ہوا اس کا فرزند! اے خدائے نور! اس کی حفاظت کر! اس نے پُرنم آنکھوں سے التجا کی اور زیرِلب دعائیں پڑھتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

۴

مزداد کا آتشکدہ شہر سے باہر کسان بستیوں کے نزدیک تھا جس کے مشرق میں چند جاگیریں پھیلی تھیں۔ اِنھیں کسان بستیوں سے کانکن، اہلِ حرفہ اور چھوٹے موٹے دکاندار طبقے کے لوگ اٹھتے رہتے تھے اور اپنی بستیاں الگ بساتے رہتے تھے، لیکن انھوں نے اپنا پرانا آتشکدہ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اب بھی اپنے محبوب پیشوا کو کورنش کرنے، جب بھی انھیں وقت ملے، اسی مندر میں آتے تھے جہاں ان سے کچھ بھی جبراً وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ یہاں انھیں ملتا تھا مزداد، یہ عجیب، کم سخن، اداس روحانی رہنما، جس کی نگاہوں میں ان کے لیے ہمیشہ بیکراں مہربانی روشن رہتی تھی، مگر اب کچھ دنوں سے جن میں ایک خاموش، صلابت بھرا پیغام جھلکنے لگا تھا۔ اسی طرح اس ضلع میں جو جاگیریں تھیں، ان کے امراء بھی اسی آتش کدہ میں حاضر ہوتے تھے۔

۵

وہ نپے تلے قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا آتش کدے میں داخل ہو رہا تھا۔ دروازے پر عُمّال کا ہجوم اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ چوکنا ہو گئے اور مودبانہ کہنے لگے:

''اے موبدِ بزرگ! کم از کم آج چڑھاوے کا اناج اور چاندی ان کسانوں میں نہ بانٹیے۔ یہ گناہ ہو گا جنابِ عالی۔ یہ آپ کے اور ہمارے لیے ہے۔''

''ہم بھوک سے مرنے لگیں گے۔''

''ہم قحط زدہ ہو جائیں گے۔''

ان کی سرگوشیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی، سانپوں کی طرح پھنکار رہی تھیں۔ مزداد سر جھکائے خاموشی سے چلتا رہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ان عمال کے گوداموں میں غلّہ بھرا ہوا ہے۔ لیکن ذخیرے جمع کرنے سے اطمینان کی جگہ ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوئی ہے اور خوف، مبادا یہ ذخائر ختم ہو جائیں، اور یہ کہ انھیں مزید کیسے بڑھایا جا سکتا ہے۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے چلتا رہا۔ وہ ان سے نفرت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ارواحِ بد، ان میں سما چکی تھیں اور غالباً حرص اور لالچ ان کا قصور نہ تھا۔ مزداد تالاب کی طرف جا رہا تھا۔

''اب میں خود کو پاک کروں گا۔ اے میرے خدا! اے خدائے رحم و مسرت! مجھ پر اپنا کرم کر۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔

معبد میں دن و رات کی ساعتوں میں موبدوں پر پانچ مرتبہ خدا کی عبادت فرض تھی۔ یہ قبل از زرتشت مزدایت کی یادگار تھی جب متھرا کی پرستش کی جاتی تھی، متھرا، سورج دیوتا، جو اہلِ بابل کا شمش تھا اور جو منبعِ آتش تھا۔ ان عبادتوں کے اوقات سورج کی حرکت کے مطابق تھے۔ اول تمجید طلوعِ آفتاب کے ساتھ، دوسری سورج کے نصف النہار پر آنے کے ساتھ، تیسری جب سورج ڈھلنے لگے، چوتھی غروبِ آفتاب پر اور پانچویں، جب سورج رات کے سفر پر روانہ ہو چکا ہو۔

''پاکیزگی اور صفائی۔ صفائی اور پاکیزگی ہی ایمان ہے!'' اس نے اَوِستا کی سطر دل میں دُہرائی۔

مزداد نے پاکی کی رسم ادا کرنی شروع کی۔ دعائیں پڑھتے ہوئے اس نے تین بار کلائی تک ہاتھ گیلے کیے۔ تین بار منہ دھویا۔ دایاں ہاتھ گیلا کیا اور تین بار دایاں پیر ٹخنے تک دھویا۔ دائیں ہاتھ

کو پھر گیلا کیا اور تین بار بایاں پیر ٹخنے تک دھویا، پھر دونوں ہاتھ کلائی تک دھوئے۔ تولیے سے ہاتھ اور منھ پونچھا۔ اب وہ تمجیدِ آتش کے لیے تیار تھا۔

وہ تاریک کمروں سے گزرا جن کی فضا عود و لوبان سے مہک رہی تھی۔ ایک عامل نے اس کی ناک پر کپڑے کی ایک پٹی باندھ دی تا کہ اس کی سانس سے آگ ناپاک نہ ہو جائے۔ ہشت پہلو تاریک کمرے میں آتش دان میں مقدس آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ کمرے میں موجود دھات کے آلات، پردوں کی کھونٹیاں، ہاون، چمٹے، ہلال کی شکل کے پائے جن پر مقدس درخت برسم کی شاخیں رکھی تھیں، آگ کی بھڑکتی روشنی میں چمک رہے تھے۔ مزداد نے کبھی بلند اور کبھی دھیمی آواز سے کتابِ مقدس کی سطور مقررہ تعداد اور مقرر انداز کے ساتھ زمزمے کی طرح پڑھنا شروع کیں۔ ایک منقش چاندی کے چمٹے سے وہ پاک کی ہوئی لکڑی کی کھپچیوں کو آگ پر ڈالتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے مقدس بوٹی ہوم کا چڑھاوا آتش پر چڑھایا۔ اب رئیسِ مراسم ''زوتر'' نے خاص دعائیں مقررہ ترتیب سے پڑھنی شروع کیں۔ زوتر کے سات مددگار مودب اور دم بخود ایستادہ تھے۔ ایک ہاونان، جو ہاون میں ہوم کوٹتا تھا۔ دوسرا آخروش جو مقدس آتش کی خبر گیری کرتا تھا۔ وہ زوتر کے بھجن میں آواز ملا رہا تھا۔ تیسرا فرابرتز جو لکڑیاں لاتا تھا۔ چوتھا آیرت جس کا کام پانی لانا تھا۔ پانچواں آسنتر جو ہوم کو چھانتا تھا۔ چھٹا ربث شکر جو ہوم کو دودھ میں ملاتا تھا اور ساتواں سروشاورز تھا جس کا فرض سب کے کام کی نگرانی کرنا تھا۔ اس کے دوسرے بھی فرائض تھے کیونکہ روحانی تربیت کا انتظام بھی اس کی زیرِ نگرانی تھا۔

''کس قدر عاجز کر دینے والا جھمیلا!'' مزداد نے اکثر سوچا تھا۔ شہر میں کوچے کوچے میں کوئی نہ کوئی آتش کدہ بنا لیا گیا تھا۔ ''یہ سب کام تو میں خود اکیلا کر سکتا تھا۔ ہونہہ!'' وہ دل میں مسکراتا۔ ''یہ آتش کدے موبدوں اور ان کے چیلے چانٹوں کے روزگار کا ایک ذریعہ ہیں۔ چلو یہ بھی ٹھیک تھا۔ لیکن یہ موبد، یہ عمال، غریبوں سے ہر رسم کے لیے جبری چڑھاوے طلب کرتے ہیں۔ جبر اور لالچ ان کے مزاج میں سرائیت کر چکے ہیں۔ یہاں، اس آتش کدے میں، ان کا دھیان آتشِ مقدس کی طرف نہیں، آنے والوں سے نذرانے وصول کرنے کی طرف لگا رہتا ہے۔ ''اس قدر آتش کدوں کی کیا ضرورت ہے!'' اس نے تلخی سے سوچا۔ ''آتشِ مقدس کو آتش کدوں کی کثرت نے ایک مذاق بنا دیا ہے۔''

کمرے کے دروازے پر چند کسان سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ آتش کدے میں تاریکی اور روشنی کا امتزاج انھیں بے حد مرعوب اور متحیر کر دیتا تھا۔ اس اندھیرے اور روشنی کے امتزاج میں کوئی الوہی اسرار پوشیدہ تھا، جس سے ان کے دل لرزتے تھے۔ ان میں اہورامزدا کا جلال تھا اور اس کی

قوت، جو ان کے سب دُکھ دور کر سکتی تھی۔

''یہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔'' مزداد نے عمّال سے کہا۔

''موبدِ بزرگ، گودام میں اناج کا دانہ بھی نہیں وہ پہلے ہی آپ کے اور ہم سب کے گھروں میں بقدرِ حصّہ بھجوایا جا چکا ہے۔'' ہاونان نے آہستہ سے کہا۔

''تم کو اس سے مطلب؟'' مزداد نے سختی سے کہا۔ ''تم سب اپنے اپنے مقامات پر واپس چلے جاؤ۔''

عمال الٹے پیر کمرے سے نکل گئے۔ قحط زدہ کسان دم بخود کھڑے رہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ وہ موبد سے دعا کی درخواست کرنا چاہتے تھے کہ خدائے بزرگ و برتر امراء کے دلوں میں رحم ڈالے اور وہ انھیں کچھ خیرات دیں۔ لیکن مزداد نے انھیں اس کا موقع نہ دیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور پھر چاندی کا چمٹا اپنے نزدیک ترین کھڑے کسان کے بوسیدہ جُبّے میں چھپا دیا۔

''پگھلا کر بیچنا۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''اور برابر برابر بانٹنا۔ خبردار! اب تم جاؤ!'' اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل آیا۔

کسان ششدر رہ گئے۔ وہ ''نہیں نہیں'' کہنا چاہتے تھے۔ آتش کدے کے مقدس چمٹے کو لے جانے کے خیال سے ہی ان کے دل لرز رہے تھے۔ لیکن ایک آگ تھی جو ان کے پیٹ میں جل رہی تھی۔ کیا یہ مقدس تھی؟ کیا یہ ناپاک تھی؟ یہ پیٹ کی آگ جو ان کے اور ان کے پیاروں کی زندگی لحہ لحہ ختم کر رہی تھی۔ وہ مجبور تھے۔ یہ چوری نہیں تھی۔ چمٹا ان کو موبد بزرگ نے خود دیا تھا۔ یہ اہورامزدا کا تحفہ تھا۔ یہ اس کی نظرِ عنایت تھی۔ کسان نے چمٹے کو مضبوطی سے بغل میں دبا لیا۔ چند لمحوں میں وہ سب جا چکے تھے۔

سہ پہر کی عبادت کے وقت آتش کدے میں کھلبلی مچ گئی۔ چاندی کا دست پناہ کہاں گیا؟ چاندی کا مقدس، نہایت قیمتی دست پناہ!

''کوئی لے گیا، معلوم ہوتا ہے۔'' مزدک نے لاپروائی سے کہا۔ ''سامان خانے سے دوسرا دست پناہ لے آؤ۔ ہمارے پاس یہ کافی تعداد میں موجود ہیں۔''

''آتش کدے میں چوری!'' آتش کدے کے عمال برآمدوں میں بلند و بالا ستونوں تلے دانت پیس رہے تھے۔ ''دیکھا ان کسانوں کو سر چڑھانے کا نتیجہ! یہ تو شکل ہی سے چور لگ رہے تھے — آہ! ہمارا موبد ہم سب کو لے ڈوبے گا۔''

٦

ٹھیک تین دن بعد اس قحط زدہ شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ زرمہر کو اس کی جاگیر پر قتل کر دیا گیا تھا۔ سات فوجی سوار اس کے گھر کھانے پر آئے تھے۔ پھر کچھ جھگڑا ہوا۔ پہرے داروں نے سواروں کو تیزی سے واپس جاتے دیکھا تھا۔ اندر زرمہر کی لاش سر بریدہ خون میں نہائی پڑی تھی۔

امراء کے حلقوں میں سرگوشیوں میں شاپور مہران کا نام لیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ سرگوشیاں فوراً ختم ہو گئیں۔ بات بڑھانے کی جرات کس میں ہو سکتی تھی۔ شاپور مہران سپاہ بذ تھا۔ افواجِ شہنشاہ کا سالارِ اعلیٰ۔ تو کیا شاپور مہران، قباد کا وفادار ہے؟ اچھا! دیکھیے کب تک رہتا ہے۔ فی الوقت خاموشی قرین مصلحت ہے۔ امراء و وزرگان و دبیران اس بات پر متفق تھے۔ زرمہر کی آخری رسوم پر بھی بہ مشکل ہی کوئی گیا۔ صرف اس کے خاندان کے لوگ موجود تھے۔ ایک تو وہ مر چکا تھا لہٰذا اب کس کام کا؟ دوسرے یہ کہ معتوب ہو کر مرا تھا۔ یہ بات ظاہر تھی۔

سیاوش، مزداد سے آتش کدے کے باہر ملا۔ وہ اپنی فوجی وردی میں تھا، طلائی زنجیریں اس کے چست لباس پر دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

''تم لوگوں نے ایک جان لی!'' مزداد نے آہستہ سے کہا۔ ''اب اس کی روح بھٹکتی رہے گی۔''

''اسی قابل تھی وہ روح۔'' سیاوش نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم کیا چاہتے تھے؟ ساری مملکتِ ایرانیان اس جاہ طلب بدبخت کے قبضے میں آ جاتی؟''

''یہ گناہ ہے۔ ڈرا دھمکا دیتے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' سیاوش نے الجھ کر کہا۔ ''وہ ہم سب کو ختم کر دیتا۔ اور... خدانخواستہ... شہنشاہ کو قتل کروانا تو اس کا پہلا منصوبہ تھا۔ کیا تم شہنشاہ کے وفادار نہیں؟''

''میں شہنشاہ کو پسند کرتا ہوں سیاوش۔ وہ بااصول، نرم دل، منصف مزاج جواں مرد ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' سیاوش مسکرایا۔ پھر اس نے چپکے سے کہا۔ ''میں تم کو شہنشاہ سے ملوانا چاہتا ہوں۔ یہ کچھ دن میں ہو جائے گا۔'' گھوڑے کو ایڑ لگا کر دھول اڑاتا وہ ہوا ہو گیا۔ مزداد اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ذرا سی دیر میں وہ بل کھاتے راستوں میں غائب ہو چکا تھا۔

''کبھی کبھی...'' مزداد سوچ رہا تھا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے جیسے سیاوش کا گھوڑا اُڑ سکتا ہے۔ یعنی اگر اس کے پر ہوں!''

۷

مزداد سہمے ہوئے کسانوں کے درمیان۔

''میں نے تم کو مٹھی مٹھی بھر اناج دے دیا۔ میرے آتش کدے میں اتنا ہی آج پہنچا تھا۔ لیکن تم جانتے ہو، امراء کے گودام غلّے سے بھرے ہوئے ہیں۔''

خاموشی۔ حلقوں میں ڈگر ڈگر ہلتی سیاہ، مایوس آنکھیں۔

''میرے بھائیو! یہ دنیا، یہ زمین، یہ پانی، خدائے بزرگ و برتر نے تخلیق کیے ہیں۔ یہ کسی کی ملکیت کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان پر گرمی سردی میں رات دن محنت تم کرتے ہو۔ بیج تم بوتے ہو۔ اناج اُگتا ہے۔ وہ تمھارا ہے۔ اناج اس کا ہے جو محنت کر کے اسے اُگاتا ہے۔ یہ تم ہو جو محترم و قابلِ تعظیم، مستحقِ ثنا اہورامزدا کے منصوبے کی تکمیل کرتے ہو کہ زمین ہری بھری رہے، اناج، پھل پھول پیدا کرے۔ یہ وزرگان اور دبیران اور امراء تو چور لٹیرے ہیں۔ تم ان سے اپنا حق چھین کیوں نہیں لیتے؟''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ انہونی ہے آقا!''

''وہ ہمیں اپنے گھوڑوں کے سموں تلے کچل پھینکیں گے۔''

''فوج کے سوار تمھارے ساتھ مل بھی تو سکتے ہیں۔'' مزدک کہتا۔

''بہت کم تنخواہوں پر گزارا کر رہے ہیں وہ بھی۔ اور پھر — وہ تمھیں پہچانتے ہیں۔ جب شہنشاہ جنگ پر جاتے ہیں تو رسالوں کے پیچھے پیادہ کون ہوتے ہیں؟ وہ سپاہی تم ہی تو ہوتے ہو۔ ان کی فتوحات تمھارے دم قدم سے ہیں۔''

خاموشی...

''وزرگان کے ذاتی فوجی دستے ہیں۔ اور... آپ جو کہہ رہے ہیں وہ گناہ ہے۔ پیامبرِ اعظم نے یہ نہیں فرمایا۔ ہم دنیا اور آخرت، دونوں سے جائیں گے، موبدِ محترم!''

بھوک چاروں طرف پھیلی تھی۔ اس سے بہت زیادہ متاثر ہونے والے اہلِ حرفہ تھے جن کے ہنر کی دھوم تھی، جن کی کاریگری سلطنتِ روم میں مشہور تھی اور جس کی اب وہ نقل کرنے لگے تھے۔ خوراک اتنی زیادہ مہنگی ہو چکی تھی کہ چھوٹے دکاندار اور تاجر بھی تمام آمدنی اشیائے خورد و نوش پر خرچ کرنے کے لیے مجبور تھے۔ وہ اہلِ حرفہ سے کام نہیں کرا رہے تھے اور ان کے گھروں میں

فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔

اور پھر مزدور تھے جو کان کنی کرتے تھے۔ سونے، چاندی، لوہے، سیسے اور نمک کی کانوں سے معدنیات اور دھاتیں نکالتے تھے۔ ان ہی میں سے تھا پناہ برزین: چوڑا چکلا، سانولا کرد، جس کے بڑے بڑے ہاتھوں میں چھالے پڑے رہتے تھے اور بالوں اور پلکوں پر نمک جما رہتا تھا۔

''نہاؤ، نہاؤ!'' مزداد کہتا۔ ''تو سالم کا سالم نمک لگے گوشت کی طرح گل جائے گا۔''

''پانی نہیں ہے۔ پانی پر پہرے لگا دیے گئے ہیں۔'' وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھاڑے مزدک کو دیکھتا۔ ''میں نمک چاٹتا رہتا ہوں۔ اب قے ہونے لگی ہے۔''

''یہ ایک ناانصافی پر مبنی نظام ہے۔'' مزداد کہتا۔

''ہاں!''

''اس شہر میں اتنا اناج موجود ہے۔ گوداموں کے تالے توڑ کر نکال لینا چاہیے۔''

''ہاں۔''

''پھر نکالتے کیوں نہیں۔''

''نکالوں گا۔ ہم میں سے کچھ نے طے کیا ہے۔ رات کو کسی گودام میں نقب لگائیں گے۔''

''کیا؟'' مزداد نے بے چینی سے پوچھا۔ ''تم چوری کرو گے؟ یہ گناہ ہوگا۔''

''عزیز آقا آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''رات کے اندھیرے میں نہیں، دن کے اجالے میں — اپنا حق مانگو اور لو۔ پناہ برزین۔ تم مجھ کو مزدوروں میں لے چلو گے؟''

''ہاں۔''

مزداد مزدوروں سے ملا۔ کان کن، چرواہے، لکڑ ہارے۔ معمار۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑے اور انھوں نے آنسو بہائے۔ لیکن چوری یا ڈاکے کے علاوہ انھیں کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ چوریاں کر رہے تھے اور ڈاکے ڈال رہے تھے۔ وہ پکڑے جا رہے تھے اور اذیت دے دے کر مار ڈالے جانا ان کا مقسوم تھا۔ جو کچھ مزداد کہتا تھا وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ ہر چیز کی مشترک ملکیت؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا! آخری الفاظ یہی ہوتے: ''مگر پیامبرِ اعظم نے یہ نہیں فرمایا۔ یہ گناہ کی مملکت ہو گی۔''

لیکن علاقے کے مزدور اور کسان مزداد کی پرستش کرنے لگے تھے۔ وہ اس کے سامنے سر بسجود نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ مزداد انھیں سختی سے ڈانٹ دیتا تھا۔ ''میں تمھارے جیسا انسان ہوں۔'' لیکن وہ

لوگ جو کچھ محسوس کرتے تھے اسے محبت کہنا انھیں نہیں آتا تھا۔

قحط کے اس زمانے میں مزدوروں کے غول اس کے ساتھ ساتھ پھرنے لگے، اور تب اس کا نام مزدک پڑا، وہ نام جو کُل مملکتِ ساسانیہ میں پہچانا جانے والا تھا۔

اور کاتبین تھے۔ عالم و فاضل، خوش خط۔ جو طویل مستطیل کمروں میں لمبے لمبے پارچوں پر ہر قسم کے مضامین کی خوش نویسی کرتے رہتے تھے۔ ان کا جاری و ساری کام تو اَوِستا کی متروک زبان میں لکھے نسخوں کو جدید پہلوی زبان میں ڈھالنا اور اسے اس نئے رسم الخط میں لکھنا تھا جو مانی نے اس مملکت میں رائج کیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ شاہی اور دفتری فرامین کی کتابت بھی انکا فریضہ تھی۔ پھر دیوانی عدالتوں کے فیصلہ جات، دواوین، مزید درباری شعرا کا کلام، جن کا نام قانونی کتابت کے ساتھ ساتھ کتابت کیے جانے کے باعث ''دیوان'' پڑ گیا تھا اور جن کی کتابت کرتے کرتے کاتبین میں سے بیشتر خود شاعر ہو گئے تھے۔ امراء سے زیادہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ مملکت کے ہنروروں کی انجمنیں تھیں لیکن ان کی انجمن نہیں بن سکتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو اپنا بدترین رقیب گردانتے تھے۔ لیکن اس قحط نے ان کی بھی حالت زار و نزار کر دی تھی۔ ان کی آمدنی کم ہو گئی تھی اور خوراک بہت مہنگی۔ ''مزدک''، ایک نیا نام ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ کون تھا یہ مزدک؟ کیا کہتا تھا؟ کیا وہ مزدک کی تقریروں کی کتابت کریں گے؟ یہ سنی سنائی باتیں تو ان تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ہاں! اگر سزا نہ ملے — اور اگر اس قحط کے زمانے میں کچھ اجرت بھی مل جائے تو کیوں نہیں؟ ارے وہ تو موتیوں کی لڑیوں کی طرح سطروں میں ایک ایک لفظ پرو دیں۔ مشترکہ ملکیت؟ یہ خیال بُرا نہ تھا۔ ان میں سے کسی کی بھی کچھ خاص ملکیت نہ تھی۔ وہ تو فائدے میں رہیں گے۔

یا پھر برزویہ تھا— شاہی حکیم — مدرسۂ جالینوس کا مقلد، جو سلطنتِ رومیہ، ہند اور عرب، ہر جگہ گھوم آیا تھا اور یونانی ادویات کا اس سے بڑا ماہر دوسرا کوئی نہ تھا۔

''آپ کیا کہتے ہیں؟'' اس کے مریض پوچھتے۔

''میں صرف سنتا ہوں۔'' برزویہ جواب دیتا۔ وہ بہت متمول تھا۔ اس نے جانیں بچائی تھیں۔ وہ جراح تھا اور اس نے امراء کو صحت مند کیا تھا۔ اس کی اپنی جاگیریں اور ایک چھوٹا سا محل تھا۔ یہ سب اس نے اپنی لیاقت سے، محنت سے، پیش ورانہ لگن سے حاصل کیا تھا۔

''یعنی کون سا نظام؟'' لوگ پوچھتے۔

وہ کسی نسخے کے اجزا گنواتا۔ پھر کہتا: ''اگر ان کو کوٹ اور چھان کر گرم پانی کے ساتھ پی لیا جائے تو نزلہ اور زکام ٹھیک ہو جائے گا۔ نظام یہ ہے، یہ تھا اور یہی رہے گا۔''

''مگر میرے سرتاج؟'' ایک رات اس کی چہیتی بانوئے قزنے پوچھا۔

''ہمارے گھر بیگار کرنے والے کسانوں کے رشتے دار نئی نئی بیماریوں سے مر رہے ہیں، جو پہلے کبھی نہیں تھیں۔ میں ان اموات سے بیزار ہوں۔ یہ کون سے مرض ہیں۔ ان کا کیا علاج ہے؟''

''بھوک کا علاج کھانا ہے۔ میں ایک پاکباز زرتشتی ہوں۔ میں خیرات دیتا ہوں۔ آج کل زیادہ دے رہا ہوں۔''

''مگر...''

''مگر میرے پاس ہزاروں بھوکوں کا روز پیٹ بھرنے جتنا اناج نہیں ہے۔ اور سچ تو کہو میری گل چہر! کیا سچ مچ سب لوگ برابر ہیں؟ کیا دوسرے طبیب میرے برابر ہیں؟ ہرگز نہیں۔ برابری کا دعویٰ کر کے نوسیکھیے میرے نسخے چرائیں گے۔ وہ غلط دوائیں بنائیں گے۔ علمِ طب زوال پذیر ہو جائے گا۔ مزدک تباہی کا نسخہ بتا رہا ہے۔''

مزدک نے کئی موبدوں سے بات کی۔

چھوٹے بڑے آتش کدوں کے یہ موبد مزدک کی قابلیت، راست بازی اور اعلیٰ قدروں کی پاسبانی کے باعث اس کی تعظیم کرتے تھے، لیکن اس کا یہ انوکھا تصور ان کے دلوں میں بے حد گھبراہٹ پیدا کر رہا تھا۔ ''یہ تو درست ہے اے موبدِ معزز، کہ مزدوروں اور کسانوں کے حالات دردناک ہیں، لیکن قناعت...''

''قناعت میرے مہربان دوستو!'' مزدک کہتا۔ ''امراء سے یہ کہنا، کہ وہ اپنے محلّات، ہزاروں غلاموں، کنیزوں، بیویوں، لذیذ ترین غذاؤں پر، غلّے سے بھرے گوداموں پر، گھوڑوں سے پُر اصطبلوں پر قناعت کرے، اور ایک مزدور سے کہنا کہ وہ اپنے جسم کے چیتھڑوں پر، اپنے فاقوں پر قناعت کرے، کیا ایک ہی مطلب رکھ سکتا ہے؟ قناعت کے معنی یہ نہیں ہو سکتے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہی ممکن ہے کہ جب کہ سب کے پاس ان کی حقیقی ضروریات کے مطابق چیزیں موجود ہوں تب وہ ایک دوسرے کی چیزیں نہ چھینیں، ہوس کا شکار نہ بنیں۔ یہ اصل قناعت ہے۔ کیا ہم کتابِ مقدس کو غلط معنی نہیں دے رہے؟''

''معزز موبد۔ روزِ ازل سے روحِ خیر اور روحِ شر میں جنگ جاری ہے۔ بالآخر تو فتح روحِ خیر کی ہوگی۔''

''آخر کیسے ہوگی؟ وہ فتح ہمارے ذریعے ہی تو ممکن ہے۔''

''اہرمن نے نو ہزار برس کے لیے دنیا پر اپنے آپ کو مسلّط کر لیا ہے۔''

''وہ نو ہزار سال پورے ہو چکے ہیں۔ کیا یہ ہم پر لازم نہیں کہ ہم اٹھیں اور روحِ خیر کا ساتھ دیں، اس کا غلبہ قائم کر دیں؟''

''جنابِ والا!'' وہ کہتے۔ ''آمیزشِ ظلمت سے نور کی رہائی اتفاقی طور پر عمل میں آئے گی جس طرح اس کی آمیزش عمل میں آئی۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم نیک پندار، نیک کردار اور نیک گفتار کے ساتھ اس رہائی کے آرزومند رہیں۔''

''مگر نیک کردار میں یہ شامل ہے کہ خیروشر کی اس جنگ میں ہم شر پر خود غلبہ پائیں۔''

یہ مباحثے بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہو جاتے۔ لیکن چند موبد ایسے تھے جن کے دلوں پر مزدک کی باتوں نے دھیرے دھیرے اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ باتیں ایسے شخص کی تھیں جس کی پاکبازی شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ حیرت انگیز تھا کہ ایک آدمی کی کہی یا لکھی ہوئی بات دوسرے آدمی کے دل تک کیونکر اتر جاتی تھی۔ الفاظ میں کوئی جادو تھا۔ الفاظ، جو آوازوں سے مل کر بنتے تھے۔ طرح طرح کی آوازیں۔ آ... با... پا... تا... جنھیں پیدا کرنے کی ناقابلِ یقین صلاحیت انسانی زبان میں تھی۔ ان آوازوں کے ملاپ سے تخلیق ہو رہے تھے، معنی — معنی جو خیال ہیں۔ بلکہ خیال سے بڑھ کر ہیں اور یہ ایتھر سے زیادہ لطیف خیال اپنا اظہار کر رہے تھے گوشت کے ایک ٹکڑے کے ذریعے۔ اندرونِ دہن، دانتوں کی ہڈیاں، تالو، اور ہونٹ کہہ رہے تھے: ''خدائے پاک، بزرگ و برتر! تب کیا واقعی تمام مادّہ ناپاک ہے؟''

مزدک ان سے ایسی باتیں بھی کرتا تھا۔

صرف عرفانی اس کی بات غور سے سنتے تھے۔

ان کی وسیع خانقاہ میں، سنگِ سیاہ وسفید کے شطرنجی فرش پر ایک کڑھے ہوئے نمدے پر مزدک چہار زانو بیٹھا تھا۔ اسے بات کرنے کے لیے ایک زرتشتی عرفانی ملا تھا جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور ''تحیر'' کے الفاظ دُہراتا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ، چہرے پر خوشی اور نیم وا آنکھیں کہیں دور، درختوں کے کسی سرسبز جھنڈ پر جمی ہوئی۔

''یہ جو آوازیں... ہمارے منھ سے نکلتی ہیں...''

مزدک نے اسے اپنے پوشیدہ خیال بتانے شروع کیے۔

''ہاں!'' عرفانی نے کہا۔ ''یہ تحیر انگیز ہیں!'' اس نے مزدک کی طرف توجہ سے دیکھا پھر کہنے لگا۔ ''اور چہرے؟ کیا چہرے تحیر انگیز نہیں؟ یہ دیکھو ہمارا لمبا سا بدن، اور اس کے سب سے اوپر یہ چہرے۔ کان، آنکھیں، ناک، یہ ساری کائنات کو ہر دم، ہر لمحہ چوس چوس کر ہمارے اندر لے جاتے

رہتے ہیں۔ اور ان سب میں دہن — آہ دہن سب سے زیادہ حیرت انگیز۔ ہونٹ، تالو، حلقوم، دانت، زبان۔ یہ خوراک کو ہمارے اندر لے جانے کا راستہ ہیں۔ اور ہونٹوں میں لذت کے سرور کا یزد ہے، جب دو ہونٹ، دوسرے دو ہونٹوں سے ملیں تو یہ یزد متحرک ہونے لگتا ہے۔ مگر ان میں سب سے تحیر خیز تو زبان ہے۔ زبان! جس میں ذائقے کی حس ہے۔ کیا ہے یہ حس! آہ! یہ حس کیا ہے؟"

عرفانی دھیرے دھیرے جھومنے لگا۔ "میٹھا، پھیکا، کڑوا، نمکین... ذائقے کیا ہیں؟ کیوں ہیں ذائقے؟" اس نے مزدک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

عرفانی نے جھک کر انگلی اٹھائی اور اس طرح بولا جیسے بہت گہرے راز کی بات بتا رہا ہو۔

"یہ ہر چیز میں پوشیدہ ہیں۔ مگر ظاہر نہیں۔ صرف اس وقت اپنا آپ ظاہر کرتے ہیں جب زبان سے انھیں مس کیا جائے۔ یہ نظر نہیں آتے۔ سنائی بھی نہیں دیتے۔ ہاں، ان کو تقریباً سونگھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اپنے ہونے کا مکمل، شاندار راز تب ہی پوری طرح افشا کرتے ہیں جب ان کا وصل زبان سے ہو۔ اور زبان ہمارے دہن میں ہے۔ اسی زبان، دانت، تالو، ہونٹوں سے ہم آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ طرح طرح کے حروف! جنھیں ملا کر لفظ بنے ہیں اور نام بنے ہیں۔ ہر چیز کے نام! کیا کچھ ہے ہمارے دہن میں۔" اس نے حیرت بھری خوشی سے مزدک کو دیکھا اور کہا۔

"انسان کے دہن میں پوری کائنات ہے۔"

"تحیّر! تحیّر!" عرفانی نے زیرِلب دُہرایا۔ پھر وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا اور دھیرے دھیرے گنگنانے لگا:

اے مٹھاس!
اے نمکینی!
تم کہاں سے آئی ہو؟
ہم خاکی انسانوں کے پاس، مہمان۔
تم بدلتی رہتی ہو۔
چھلکے کے اندر خامشی سے۔
کڑواہٹ ہولے ہولے مٹھاس بن جاتی ہے۔
ہمیں کیا بتانا چاہتی ہو تم؟
زبان جانتی ہے، صرف زبان۔

"ہاں!" مزدک نے زیرِلب کہا۔ پھر وہ اٹھا اور خانقاہ کے دروازے کی طرف چلا۔ رامش گروں

کا ایک طائفہ اپنے موسیقی کے آلات اٹھائے اندر آ رہا تھا۔ اس شام انھیں رقص و موسیقی کی محفل برپا کرنی تھی۔ بارگاہ اہورامزدا میں وہ الوہی یزد ''خوشی'' کے خدمت گار تھے۔ آج کسی عرفانی کی ''شبِ زِفاف'' کی تقریب تھی۔ ایک ایسی رات جو پُراسرار تھی اور باہر کے لوگ جس کے بارے میں بہت کم جانتے تھے اور چہ میگوئیاں کرتے تھے۔

مزدک کو عرفانی سے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا، لیکن اس کے خیالوں کو تقویت حاصل ہوئی تھی۔ وہ مسکرایا۔ اسے ایک ایک نکتے کی انتہائی گہرائی تک جانے کی کوششوں پر پیار آتا تھا۔ ''یہ تحقیقی ہیں'' وہ سوچتا۔ اور اپنے لیے تجسّس اور تحقیق کا کوئی دروازہ بند نہیں رکھتے۔ وہ جسم کے ہر عضو پر غور کرتے تھے اور نرینہ عضو پر ''تحیر! تحیر!'' کی سرگوشیاں کرتے تھے... آخر یہ کیا تھا؟ اگر بیکراں کائنات میں پاک قوتوں ''زوران'' کا کوئی ارادہ تھا، تو کیا یہ اس ارادے کی تکمیل کا آلہ نہ تھا؟ اور اس میں لذت کی طاقت کیا تخلیق کی لذت کا مظہر نہ تھی؟ خوابیدہ، جو لمس سے بیدار اور متحرک ہو جاتی ہے۔

ان کے لیے عضو نرینہ کائناتی قوتوں کا امین تھا، انسان میں الوہیت کا سراغ، اور وہ سب اس کی بہت تکریم کرتے تھے اور کپاس بھری مخمل سے بنائی ہوئی اس کی شبیہوں سے اپنے کلاہ مزین کرنے کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

مزدک عرفانیوں کے طور طریقوں کا سرسری سا خیال ذہن میں لیے دروازے سے باہر آیا۔ اس نے اپنے رتھ بان کو آواز دی... ایک بار پھر اس کا خیال حروف پر مرکوز ہو گیا۔

''حروف میں ایک اسرار ہے! ایک قوت ہے ان میں۔''

اس نے سوچا اور رتھ میں سوار ہو گیا۔

۸

بہت دنوں کے بعد یہودی جوشوا اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ طیسیفون کے مشرقی علاقے میں یہودیوں کی بستی میں رہتا تھا جو دور دور تک پھیلی تھی۔ اس علاقے میں خوشحال باسیوں پر قحط کا زیادہ اثر نہیں پڑا تھا لیکن غریب یہودی دانے دانے کو محتاج ہو گئے تھے۔

جوشوا اپنی قوم کے مدرسے میں استاد تھا، خوبصورت خدوخال کا ادھیڑ عمر محقق، وہ دینِ زرتشت کے بارے میں معلومات جمع کر رہا تھا۔ مزدک سے اس کی ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ ان دو شخصیتوں میں، جو بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، کھانے پینے میں، لباس میں، خاندانی پس منظر میں۔ پھر بھی وہ کیا رشتہ تھا جو بہت جلد ان کے درمیان قائم ہو گیا تھا؟ ایک رشتۂ درد، جو انھیں یکساں بے چین رکھتا تھا۔

''موبد! ہزار برس سے زیادہ ہوئے، میری قوم کو بھی ایک خواب ملا تھا۔'' اس نے مزدک کو بتایا۔ ''جو خداوند کا نام ہے، اس کی مملکت کا خواب، جہاں سکون ہو گا، چین ہو گا۔ جہاں زور آور کمزوروں پر ستم نہ ڈھائیں گے، جہاں بھیڑیا، برّے کو نہ چیرے پھاڑے گا۔ ہمیں بھی بتایا گیا تھا کہ ایسی مملکت ایک دن ضرور قائم ہو گی۔''

''ہزاروں برس سے انسان نے زمین کے ہر ٹکڑے اور ہر گوشے میں یہ آرزو کی ہے۔ امن اور انصاف کی آرزو، جنگ اور ستم سے زیادہ پرانی ہے یا— شاید... یہ ساتھ پیدا ہوئیں۔ آخر دنیا کے دور دراز کے حصّوں میں، انسان کیوں یقین کرتا رہا ہے کہ ایسی مملکت ضرور قائم ہو گی؟ کیونکہ یہ اس کی ضرورت ہے، اور اسی لیے اس کی آرزو۔ تمھاری باتوں سے مجھے تقویت ہوتی ہے یہودی!'' مزدک نے کہا۔ ''لیکن تمھارے موبدوں کو ان یہودیوں کا خیال کبھی نہ آیا جو بدحال ہیں، جو ایک ظالمانہ چکی میں پستے رہتے ہیں؟''

''توریتِ مقدس میں ظالمانہ سود کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔'' جوشوا نے کہا۔

''لیکن جو رقم وزرگان اور ہمارے اپنے موبد غریبوں کو قرض دیتے ہیں، ان پر سود در سود اور اس کی وصولی کے ماہرین تمھاری آبادی سے آ رہے ہیں۔ وہ بھاری انعام و اکرام پاتے ہیں۔ وہ تو سلطنتِ رومیہ میں اسی طریقے کو وسیع پیمانے پر رائج کر رہے ہیں۔''

''رومی اور ایران شہر کے سپاہیوں کے لہراتے ذرّوں کے بغیر وہ کیا کر سکتے تھے مزدک؟ ہم تو صدیوں سے بے مملکت ہیں۔ جلاوطن... ہاں، مگر ایسے لوگ ماہرین ہیں۔''

''انھوں نے آریانوں کو دولت سے دولت پیدا کرنے کا ڈھب سکھایا؟'' مزدک نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔ ''سنا ہے ہند میں بھی یہ رواج عام ہے۔''

''دولت کو جمع بھی تو ہونا ہے۔ ورنہ... ورنہ شاندار سلطنتیں کیوں کر بنیں گی؟''

''یروشلم کے پیغمبر [حضرت] عیسیٰؑ مفلسوں میں رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مفلس زمین کا نمک ہیں، وہ مچھیرے اور زمین کھودنے والے محنت کش۔ وہ بھی کہتے تھے کہ انصاف کی مملکت آئے گی اور یہ بھی کہ مفلس عوام خدا کی اس زمین کے وارث ہیں۔''

''یسوع!'' جوشوا نے کہا۔

''پیغمبر یسوع!'' مزدک نے کہا۔

جوشوا کھسیانے پن سے مسکرایا۔ اس نے کہا:

''عبرانی انھیں پیغمبر نہیں مانتے۔''

''آخر کیوں؟'' مزدک نے تجسس سے پوچھا۔

''ہماری کتابِ مقدس میں آنے والے پیغمبر کی جو نشانیاں تھیں، وہ ان میں نہیں تھیں۔''

''کیا نشانیاں؟''

''ایک تو یہ تھی کہ آنے والا سچا پیغمبر ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کرے گا۔ انھوں نے ہیکل تو بنایا نہیں۔''

مزدک ہنس دیا — اس نے کہا:

''بس اتنی سی بات پر؟'' پھر اس نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''یا اصل وجہ یہ تھی کہ یسوع منافع خوری کی حرص و ہوس کو دین کی پاکیزگی سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے عبادت گاہ میں سکّوں کا کاروبار کرنے والوں کے خوانچے الٹ دیے تھے۔''

''ایک ناقابلِ حصول آرزو...'' جوشوا نے کہا۔ ''عبادت گاہوں کا تزک و احتشام، موبدوں کا رعب داب، دولت کے بغیر کہاں ممکن ہے میرے دوست؟''

''مگر وہ یقیناً پیغمبرِ خدا تھے۔ خدائے پاک نے ضرور ان سے کلام کیا تھا۔'' مزدک نے کہا۔ ''وہ طبیب تھے، مانی کی طرح۔ جانتے ہو جوشوا، مانی نے یسوع کی تعلیمات سے محبت اور شفقت کا، عفو کا درس حاصل کیا تھا۔ یسوع مسیح تھے، ان کے ہاتھ میں شفا تھی۔''

مزدک کسی اپنے ہم قوم کے سامنے یہ الفاظ نہ کہتا۔ مانی کے لیے عقیدت اس کے سینے میں چھپا ایک گہرا راز تھی۔

جوشوا نے کہا:

''میں بھی یسوع سے پیار کرتا ہوں مزدک... مگر اس کے لیے ان کو خدا ماننا لازم نہیں اور پھر۔''

''کیا؟'' مزدک نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ مسیحی... تم خود ذرا دیکھو، مملکتِ ساسان میں، نسطوری مسیحی اور یعقوبی مسیحی ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اس مسئلے پر کہ یسوع کی فطرت ایک تھی، یا وہ انسانی اور ربانی، دو فطرتوں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ اسی طیسیفون میں، مسیحی علاقوں کے مدرسوں میں ان کے درمیان کتنی شدید پیکار رہتی ہے۔''

''ہوں!'' مزدک نے کہا پھر سنجیدگی سے اس نے جوشوا کی طرف دیکھا۔ ''اصل جھگڑا ان کے پیشواؤں نے پیدا کیا ہے، ان جاگیروں اور انعامات کے لیے جو وزرگان اور دینِ زرتشت کے بڑے موبد انھیں اپنے ساتھ ملائے رکھنے کے لیے دیتے رہتے ہیں۔''

''کیوں؟ کیا خیالات، عقیدے نہیں ٹکراتے۔''

''خیالات؟'' مزدک نے ہنس کر کہا۔ ''بے شک ٹکراتے ہیں، لیکن وہ خون خرابہ نہیں کر سکتے۔ خون خرابہ تو ہتھیاروں سے ہوتا ہے اور ہتھیار دولت سے آتے ہیں، اور جو دولت مند ہیں، وہ دولت لگاتے ہیں، اپنے فائدے کے لیے، یہودی دوست، خیالات تو یزد ہیں۔ ٹکراؤ میں وہ ایک دوسرے سے جفت ہو جاتے ہیں۔ اور پھر...''

''اور پھر؟'' جوشوا نے دُہرایا۔

''پھر پیدا ہوتا ہے ایک نیا خیال۔'' مزدک نے اچھے خاصے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''مبارک! مبارک! طفلِ نو کے لیے مبارک!! لوگ دھوم دھام سے جشن مناتے ہیں۔''

''اور تمھارے خیالات؟ وہ کن خیالوں سے مل کر بنے ہیں؟'' ذہین یہودی نے پوچھا۔

مزدک نے سر جھکا لیا۔ وہ سوچتا رہا۔ پھر اس نے گردن اٹھا کر کہا۔ ''مجھے پتہ نہیں۔ شاید یہ انسان کی آرزوؤں سے مل کر بنے ہوں۔ جوشوا، میرے دین میں، دنیا میں جو کچھ ہو، وہ تو امکان ہے۔ لیکن 'خیر' اہورامزدا کا ارادہ ہے۔ اور اس ارادے کی تکمیل انسان کے سپرد ہے۔ انسان اہورامزدا کا شریکِ کار ہے۔''

ہوں۔ یاد رکھو — یہ خدا کی رضا — نہیں ہوسکتی کہ تمھارے مفلس محنت کش بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دیں۔'' جوشوا اس سے رخصت ہوا۔

مزدک باغیچے کی سوکھی گھاس پر چت لیٹ گیا، رات کا دوسرا پہر قریب الاختتام تھا۔ ہوا ٹھنڈی ہو چکی تھی اور خوشگوار جھونکے کہیں جلتے ہوئے خوشبودار سفوفوں کی مدھم مہک سے معطر تھے۔ اوپر گہرے نیلے آسمان پر کہکشاں جگمگا رہی تھی۔ مزدک غور سے کہکشاں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر رہا تھا۔ اس کے لوگ اسے ''گایوں کا راستہ'' کہتے تھے۔ وہ گائے بیل سے پیار کرتے تھے۔ باختریا سے طیسیفون تک... جو ان کی زندگی کے ضامن رہے تھے۔ دودھ دینے والی معصوم گائے اور بیل انکے ساتھ ساتھ رہتے آئے تھے۔ قدرتِ خدائے پاک نے جیومرث کو تنہا پیدا نہ کیا تھا۔ جیومرث بلند پہاڑوں پر ایک سپید، بے حد توانا بیل کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ جیومرث، جس کا اصل نام ''جیومرتن'' تھا۔ وہ ''جیو'' جس کی ''مرتو'' ہونی تھی: حیاتِ فانی۔ اس کا ساتھی تھا اس کا بیل، جو دنیا کی مادی قوتوں سے، سر جھکا کر اپنے تیز خنجر جیسے دھاردار اور مضبوط سینگوں سے لڑ سکتا تھا۔ جو فانی انسان کی طرح حسین اور پُرشکوہ تھا اور گو بعد میں پیدا ہونے والی اپنی مادہ کی طرح بے حد فرمانبردار، بھولپن کی مورت نہ تھا، لیکن سدھایا جا سکتا تھا، اس کی ہی پیٹھ پر سوار ہو کر جیومرث پہاڑ کی دشوار، سنگلاخ بلندی سے نیچے اترا تھا۔

ہزاروں برس سے یہ خیالات آریانان کے ذہن میں جاگزین تھے۔

اس کے بعد بہت کچھ ہوا۔

ہند کے ایک ہرے بھرے کنارے پر گوتم آئے۔ حیرت انگیز فانی انسان، جس نے دکھوں سے نجات کا راستہ ڈھونڈا۔ انھوں نے جات گوت کی شدید سخت تقسیم مسترد کر دی، جو کہتے ہیں، شہنشاہ جمشید نے متعین کی تھی، جو اتنا قدیم تھا کہ اس کے بارے میں اُڑی مٹی روایتوں کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ بدھ نے ہند میں، اپنی خانقاہوں میں ایسی محنت کش ذاتوں کو مدعو کیا جن کا چھونا تو کجا، ان کا سایہ پڑنا بھی ہندی موبدوں نے گناہِ شدید بنایا تھا۔ لیکن انھوں نے بھی غربت کا حل نہ ڈھونڈا۔ ان کے خوبصورت آٹھ پتیوں کے گلِ نیلوفر میں کوئی پتی تبدیلی کا راستہ نہ دکھاتی تھی۔ قانون پر چلو۔ یہی ان کا فرمان تھا۔ کیسا قانون؟ مفلسوں سے، کسانوں سے بیگار لینا بھی تو قانون تھا۔ پھر مقدونیہ سے سکندر آیا۔ اس کی افواج نے آریانی دارا کو شکست دے دی۔ عجیب بادشاہ جو اپنے ساتھ تاریخ نویسوں کو لیے پھرتا تھا۔ وہ ساسانی بادشاہوں کی بنائی ہوئی وسیع شاہراہوں پر گھوڑا دوڑاتا آیا اور ساسانی بادشاہوں کی تعمیر کردہ وسیع و عریض آرام دہ کارواں سراؤں

میں قیام و طعام کی وافر سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور آریانوں کو شکست دی۔ اس کی فوج نے آتش کدوں کو ڈھا دیا اور اَوِستا کے نسخے جلا ڈالے۔ وہ قدیم ترین مخطوطے جو ہزار برس پہلے اس وقت گائے کے گوشت کی باریک جھلیوں پر لکھے گئے تھے جب کاغذ بنانا انسان نے نہ سیکھا تھا۔

''یہ سب باطل ہے۔'' سکندر نے کہا۔ ''میں دنیا کو ظلم و ستم سے آزاد کرنے کے لیے فتح کروں گا۔'' وہ اپنے ہی طریقے کو درست سمجھتا تھا۔ شاید اسے اپنے استاد پر ناز تھا۔ شاید وہ ناز کے قابل بھی تھا— مزدک سوچ رہا تھا۔ ارسطو پیغمبر نہ تھا حالانکہ دنیا کا کوئی موضوع نہ تھا جس پر وہ غور و خوض نہ کرتا رہا ہو۔

سکندر چلا گیا۔ اس کی فوج اس کے ساتھ چلی گئی اور کچھ لوگ رہ گئے۔ وہ رہ گئے اپنے خیالوں کے ساتھ، اور دنیا کے پانچ عناصر کے ساتھ۔ مادہ، پانی، ہوا، آگ اور ایتھر، اور جدلِ اضداد کے ساتھ، اور بحث و مباحثہ کی رسم کے ساتھ، اب آریان بات بات پر مناظرے برپا کرتے تھے۔

کیا ان میں سے بہت کچھ آریانان سے ہی مستعار نہ تھا؟ وہ مشہور دس ہزار انسان، جنھوں نے سب سے پہلے یونان میں وہ لوگ آباد کیے تھے جو بعد میں یونانی کہلائے، وہ تو آریانوں کے اولین شہنشاہ کوروش نے ہی جمع کیے تھے۔ اس نے ان کی ایک فوج بنائی تھی۔ وہ اس سرزمین پر رہے تھے لیکن کوروش نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور یہ دس ہزار یونانی قوم کے بیج، پیدل چل کھڑے ہوئے اور یونان میں پہنچ کر دم لیا۔

آریانان ایتھر کو نہ جانتے تھے۔ یہ یونانیوں کا عناصر کائنات میں اضافہ تھا۔ مزدک کو یاد آ رہا تھا۔ مانی نے ''ایتھر'' کو مادہ کائنات میں سے ایک ہونے کا تصور یونانیوں سے لیا تھا کیونکہ زمین پر دور دراز بکھرے لوگ ہر ساعت ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ لیتے دیتے رہتے تھے۔ خیالات جو سرعت سے ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں داخل ہو جاتے۔

مگر اسی یونان میں، اسی فلسفیوں کی فردوس میں، غریب یونانی خود کو قرض کے بدلے بیچ دیتے تھے۔ یہی سلطنتِ رومیہ میں بھی رواج تھا۔ ہر خوشحال یونانی کے پاس کم سے کم ایک غلام تھا جس نے غربت کے باعث اپنے آپ کو یا اپنے بیٹے کو فروخت کر دیا تھا۔ اس کے لیے بھی کئی قوانین بنائے گئے تھے۔ ایسے غلاموں کو کب اور کتنا مارنا پیٹنا جائز ہے؟ خون نکلے یا نہ نکلے؟ کہاں مارا جا سکتا ہے؟ مزدک نے تلخی سے ہونٹ بھینچ لیے...

یہ یاد کر کے اس کے چہرے پر مہربانی کے تاثرات لوٹ آئے کہ یونانیوں کے خیالات بے مثال

تھے۔ یہ اضداد کی جدال کے خیالات آریانوں میں واپس لائے تھے۔ وہ صداقت جو پیغمبر بزرگ اہورامزدا نے نور وظلمت کے جدل کی دی تھی۔ یہ بھی مزدی رہے ہوں گے۔ اب مزدا کو زیوس کہتے ایران شہر واپس لوٹے ہیں کیونکہ ان کی زبان صحیح تلفظ پر مڑتی نہ تھی۔

روحِ توانا... روحِ خیر تھی۔ روحِ شر سے اس کی کش مکش تھی۔ ایک ازلی جنگ!

مزدک، جو موبد تھا، جو اپنے آتش کدے میں پانچ وقت کی مقررہ دعائیں پڑھتا تھا، ہر بار ان دعاؤں کے اختتام پر زیرِلب کہتا تھا۔

''اور اے اہورامزدا، تیرے ارادے کو تکمیل تک پہنچانے والے، تیرے شریک کار ہم، تیری رضا کے مطابق، اب کرتے ہیں، تیری زمین پر ناانصافی کا خاتمہ...''

اس نے ایک بار پھر یہ دعا دُہرائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس لمحے معجزہ رونما ہوا، وہ کہ تخلیقِ کائنات کے ساتھ ساتھ ذاتِ انسان میں کسی پُراسرار زور، کسی سراسر انجانی قوت کا ناقابلِ تردید، اعلیٰ ترین معجزہ تھا۔ مزدک کے غیر مرئی وجود میں یزدِ تخیل نے پر پھیلائے۔ یہ پر مزدک کو صاف نظر آ رہے تھے، یہ اتنے بڑے پر تھے کہ انھوں نے پورے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ صاف، اجلے، دودھ سے زیادہ سپید پر، جن میں کبھی نیلگوں اور کبھی گلابی رنگ جھلکنے لگتا۔ مضبوطی سے، کبوتر کے پر کی طرح گتھے ہوئے، ان کا نچلا حصّہ مزدک کو صاف نظر آ رہا تھا۔

''اگر لوگ اہورامزدا کے فرمان پر ہی چل سکتے ہیں، تو تم میرے پیغام بر ہو۔''

مزدک نے صاف صاف سنا۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا جیسے چاروں طرف برف گرتی ہو اور وہ شدت کی سردی سے کانپ رہا ہو۔ صرف بدن نہیں، اس کی سانس بھی لرز رہی تھی، اور پہلو میں دل بہت آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ مزدک نے آنکھیں کھولیں۔ اب وہ پھر آسمان کو دیکھ سکتا تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ مزدک اب بھی سر سے پیر تک لرز رہا تھا۔ اس نے مٹھیوں میں سوکھی ہوئی گھاس مضبوطی سے جکڑ لی۔ اس نے کہا:

''خدائے پاک نور ہے۔ اس نور کے عناصر...'' اسے مانی کا قول یاد آیا، ''ایثر، ہوا، روشنی، پانی اور آگ۔'' مزدک نے مضبوطی سے کہا: ''مادہ! یہ خاک؟ یہ اثبات روحِ خیر کا عنصر ہے۔ نورانی ہے خاک بھی'' اس نے پھر شروع کیا:

''نور کے تین عناصر ہیں۔ پانی، آگ اور خاک۔'' پھر اس نے کہا۔ ''اور اس کے حضور میں چار قوتیں حاضر ہیں۔ تمیز، عقل، حافظہ اور ... خوشی۔ یہ چاروں یزد انسان کے اندر موجود ہیں۔'' مزدک نے کہا۔

''اور اب میں اٹھتا ہوں۔'' اس نے زیرِلب کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کے اندر آ گیا۔ وہ اپنے گھر کے آتش کدے میں گیا۔ ''یہ آتشِ خانہ ہمیشہ روشن رہے۔'' اس نے سر جھکا کر کہا اور آگ پر خوشبودار لکڑی کے کچھ اور ٹکڑے ڈالے۔

وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چلا۔ دینگ کے حجرے میں شمع جل رہی تھی۔ اس نے کمرے میں جھانکا۔ دینگ جاگ رہی تھی۔ شفقت اور محبت سے مزدک نے کہا:

''تم سوئی نہیں اب تک؟ سو جاؤ۔ معصوم قزبانو۔''

اس نے دینگ کی پیشانی پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ دینگ نے آنکھیں بند کر لیں۔ مزدک اپنی خوابگاہ میں آ گیا۔ پُراعتماد اور سنجیدہ، وہ بستر پر دراز ہو گیا اور اَوستا کی دعائیں پڑھتے ہوئے سو گیا۔

۹

قباد محل میں اپنے ذاتی کمرے میں داخل ہوا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈال کر وہ اپنی مرصع آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ اس نے ریشمی پارچے سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور تن بدن کی خفیف سی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پھر اس نے تالی بجائی۔ زرتار پردے میں جنبش ہوئی۔

''عالی جاہ!'' کنیزِ خاص کی آواز آئی۔

''کچھ پینے کو...'' قباد نے کہا۔ ''شراب نہیں — میں کھانا کھا کر آیا ہوں — پانی — یا عرق۔''

کنیز سونے کے تشت میں بلوریں جام لیے حاضر ہوئی۔

ایک تشتری میں سونے کے ورق لگے پستوں کے لوزینے ساتھ تھے۔ پھر وہ غائب ہو گئی۔

قباد نے یخ عرق کا گھونٹ بھرا۔ پھر دیوار کے نقش و نگار پر نظریں جما دیں۔ وہ شہر سے دور چند چنیدہ وزرگان کی دعوت سے واپس آیا تھا اور ان کی بدتمیزیوں پر ششدر تھا۔ وہ اس کی ہر بات کی بلا تامل مخالفت کر رہے تھے اور اپنی تائید کے لیے جاماسپ سے بار بار رجوع کر رہے تھے۔ جاماسپ اس کا سگا چھوٹا بھائی، جو ابھی کم سن تھا۔ ناتجربہ کار... وہ کچھ خاص سمجھ دار بھی نہ تھا۔ قباد کے مقابلے میں اپنی اہمیت دیکھ کر وہ خوش تو ضرور ہو رہا تھا لیکن معاملتِ سلطنت سے نا آشنائی کے باعث صرف گردن ہلا سکتا تھا۔ اس کو یہ عمائدین مکاری سے اپنی تائید پر مبنی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''دیکھا! آپ ہی ٹھیک سمجھے!'' وہ بار بار کہتے۔

''تو اب وہ جاماسپ پر ڈورے ڈال رہے ہیں!'' قباد نے تلخی سے سوچا۔ اس کی تاج پوشی کرنا چاہتے ہیں! اور اس کے لیے... پہلے مجھے قتل کرنا ہوگا۔''

اب وہ بالکل پرسکون ہو چکا تھا۔ وہ ایک مضبوط اعصاب کا جوان تھا، گو اس کو ابھی اپنی قوت کی آزمائش کا موقع نہیں ملا تھا۔ شاید اب وہ وقت آ گیا ہے۔

یہ تخت و تاج اس کو کیسے مل گیا تھا؟ اگر شہنشاہ پیروز کو سفید ہنوں نے شکست نہ دی ہوتی تو شاید یہ ممکن نہ ہوتا۔ اس سے پہلے انھوں نے ایران پر حملہ کیا تھا مگر بہرام پنجم اور یزدگرد دوم نے انھیں کامیابی سے ایران کی سرحدوں سے نکال دیا تھا۔ لیکن پھر پیروز تخت نشین ہوا اور ہن قوم کا مقابلہ نہ کر سکا۔ سلطنتِ ایران زیر و زبر ہو گئی۔ شہنشاہ کمزور ہو گیا اور وزرگان اور آزادگان اور

موبدوں کی بن آئی۔ وہ طاقت ور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ ان کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا۔
پیروز بہادری سے لڑا تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں مارا گیا تھا، جب کہ سفید ہن صوبہ ہرات کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وزرگان نے ہی پیروز کے چچازاد بھائی کو تخت پر بٹھایا تھا جس کو بالاش کہتے تھے۔ شاید وہ بالاچ تھا۔ اس ساسانی خاندان کی اولاد جس نے مملکت کا آخری جنوبی کنارہ صوبہ مکران یا سیستان فتح کیا تھا اور پھر صدیوں سے وہاں بستے آرہے تھے۔ سیاسی ضروریات تو سلطنت کے کونے کونے سے ممتاز شخصیتوں کو کھینچ کھینچ کر پایۂ تخت تک لے آئی تھیں۔ لیکن یہاں طیسیفون کے پاس، عربی تلفظ رائج تھا اور اسے بالاش ہی کہا گیا۔ بالاش سخی اور منصف مزاج شہنشاہ تھا۔ اسی لیے وزرگان کو زیادہ دن پسند نہ رہا۔ ان کے منھ کو دولت اور اقتدار کا خون لگ گیا تھا۔ بالاش سفید ہنوں سے صلح کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ایران اب مزید خون خرابے کے لیے تیار نہ تھا۔ کئی برس کی جنگ نے عوام کو بدحال کر دیا تھا۔ وزرگان نے اس کے خلاف بغاوتیں کروائیں اور پھر اس کی آنکھوں میں پگھلا سیسہ ڈال کر اسے اندھا کر دیا۔ تب ان کی نظرِ انتخاب قباد پر پڑی جو بالاچ کا نوجوان بھتیجا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ نوجوان تھا؟ ان کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن سکتا تھا؟
"مگر غلط سمجھے تھے۔" قباد نے کہا۔ وہ اب پُرسکون تھا۔ وہ کرسی سے پورے قد سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک نظر سچّے موتیوں کی کلاہ پر ڈالی جو اس نے کمرے میں داخل ہو کر طاق پر رکھ دی تھی، پھر وہ ٹہلنے لگا۔

"وہ غلط سمجھے تھے۔" قباد نے دل میں دُہرایا۔ اس کی رگوں میں وہ شاہی خون دوڑ رہا تھا جس کی تاریخ ہزاروں برس پر محیط تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو ایک کہکشاں نظر آتی۔ اردشیر بابکان، اس کی فتوحات، کرمان، اصفہان، فارس، سوسیان، بحرین، سیستان، خراسان، مرگیانا، جس نے عظیم شہر بسائے، جیسے خود طیسیفون، جس نے مملکت کو ایک الوہی کتاب اَوِستا کے مطابق ڈھالا پھر شاپور، جس نے دریاؤں پر بند باندھے اور پانی کو مسخر کر لیا، جس کے دور میں آریانائی فنونِ لطیفہ ختن تک جا پہنچے، یزدگرد، ہرمزد۔ اور ان سب کے ادوار میں انصاف اور عوامی خوش حالی کی ایک دنیا قائم تھی۔ وہ اس سلطنت کا وارث تھا... وہ اس روایت کو مزید روشن کرنا چاہتا تھا۔

اور یہ موبد! ہر قسم کی سازشوں میں ملوث۔ لالچی! اب ان میں پاکیزگی کہاں ہے؟ نیک خیال، نیک گفتار، نیک کردار! کچھ بھی تو باقی نہیں! اگر ہے تو یہ سچ کیوں نہیں بولتے؟ کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ قحط میں غریب مر رہے ہیں۔ بھوک سے مر رہے ہیں۔ "وہ قحط سے پہلے بھی بدحال تھے۔" موبد دراز داڑھیوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر کہتے ہیں۔ تو پھر جاگیردار لگان میں ایک حصہ ان کی بہبود کے

لیے وقف کیوں نہیں کرتے؟ ''اناج پر کیا محصول دیا جا سکتا ہے؟'' وہ کہتے ہیں۔ ''اناج کوئی باقی رہنے والی چیز تو نہیں۔ یہ تو ختم ہو جاتا ہے۔ گل سڑ جاتا ہے۔ جبکہ محصول تو قائم رہتا ہے۔ ذرا آپ ہی سوچیے۔ ادھر آپ نے محصول لگایا، اُدھر اناج ختم ہو گیا۔ تو محصول کس چیز پر لگا؟ کیا ایسی چیز پر جو ہے ہی نہیں؟ ذرا سوچیے عالی جاہ!'' قباد طنز سے مسکرایا۔

وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا اور اس کے دماغ سے یہ بات نکل چکی تھی کہ اس نے خاص پہریداروں اور محل کے منتظمین کو حکم دیا ہے کہ آج رات سیاوش کو اس کے کمرۂ خاص میں مکمل خاموشی اور رازداری کے ساتھ آنے دیا جائے۔

اچانک وہ مڑا تو سیاوش اور مزدک دروازے کے پردوں کے چوکھٹے میں ایک تصویر کی طرح جڑے تھے۔

''اوہ!'' اس نے کہا، اور اس کی نظریں نو وارد اجنبی کے سراپے پر جم کر رہ گئیں۔ دراز قد اجنبی ایک مہین سفید عبا میں ملبوس تھا۔ اس کی خوبصورت داڑھی اور بال سیاہ تھے۔ بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھیں، گھنے ابرو، ستواں ناک، ایسا دہن جس سے مہربانی مترشح تھی۔ چہرے اور سراپا سے ایسی پاکیزگی ہویدا تھی کہ ایک لمحے کو قباد کو یوں لگا جیسے اس کے کمرے میں کوئی فرشتہ داخل ہو گیا۔ یہ کیسا موبد تھا! دوسرے موبدوں کے برخلاف اس نے قباد کی مدد کی تھی اور اس کی جان بچائی تھی۔ قباد پہلی نظر میں مزدک کا گرویدہ ہو گیا۔

مزدک محل کی بھول بھلیوں سے جن دشواریوں اور تلاشیوں سے گزرا تھا انھوں نے اسے حیران کر دیا تھا۔ یہ شہنشاہ کا خاص کمرہ تھا جہاں اس کے بیٹے تک کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن شہنشاہ یوں بھی رعایا میں سے ماسوا وزرگان و آزادگان کسی عامی سے نہیں مل سکتا تھا۔

''آپ تک رعیت کے خطوط بھی نہیں پہنچتے۔ ان کو جواب معمولی افسران دے دیتے ہیں۔ آپ کو کسی سے ملنے نہیں دیا جاتا۔ وزرگان اور موبدان کی آپ کے خلاف سب سے بڑی سازش یہ ہے کہ آپ کو اپنی مظلوم، بے کس اور آپ کی وفادار رعیت سے بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔'' کرسی پر بیٹھنے کے بعد مزدک نے قباد سے یہ پہلی بات کی۔

''رعیت!'' قباد نے آہستہ سے دُہرایا۔ ''وہ اس وقت شدید مصائب کا شکار ہیں۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن... میرے عمائدین سلطنت... آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔''

''اس سلطنت میں صرف عمائدین نہیں بستے عالی جاہ۔ آپ عوام کو اپنے ساتھ لیجیے۔ یہ

منصب داران حکومت آپ کا بال بیکا نہیں کر سکیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' قباد نے کہا۔

''منصب داروں کی قوت اور طاقت ان کے مال و دولت کے باعث ہے۔ یہ دولت، یہ ملکیت ان سے چھین لیجیے تو وہ بے دست و پا ہو جائیں گے۔''

''ان کے اپنے فوجی دستے ہیں۔'' قباد نے تفکر سے کہا۔

''آپ کا سپاہ بذ، شاپور مہران آپ کا وفادار ہے۔'' مزدک نے کہا۔ ''آپ امراء کے گوداموں کے دروازے کھلوا دیجیے۔ آپ کی رعیت فاقوں سے بدحال ہے اور سسک سسک کر مر رہی ہے۔ آپ تمام اناج ان میں تقسیم ہو جانے دیجیے۔ امراء کے محلات کے اندر غریب عوام کو داخل ہو جانے دیجیے۔''

قباد پوری آنکھیں کھول کر مزدک کی باتیں سن رہا تھا۔ امراء کی طاقت ختم ہونے سے، ان کا مال و اسباب لُٹ جانے سے اس کا کیا نقصان ہو سکتا تھا؟ کیا وہ اپنے مظلوم عوام کے ساتھ مل کر ایک بالکل منصفانہ، خوشحال، مضبوط سلطنت کی بنیاد نہیں ڈال سکتا تھا؟ یقیناً وہ ایسا کر سکتا تھا! اس کا دل دھڑکنے لگا۔

''کسان میرا محل بھی چھین لیں گے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں۔'' مزدک نے کہا۔ ''وہ اس کی حفاظت کریں گے۔ وہ اپنے محسنِ اعظم پر آنچ نہ آنے دیں گے۔'' پھر اس نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو، اور آپ کے خاندان کو، کتنی خوراک چاہیے؟ کتنے لباس؟''

قباد مسکرایا۔ ''بہت زیادہ نہیں۔ لیکن... '' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اقتدار کی ضرورت ہے۔ اختیار کی — طاقت کی — اس کے بغیر میں... '' پھر اس نے موبد کی روشن سیاہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''اس کے بغیر ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔''

''اصل طاقت آپ کے پاس اب آئے گی عالیجاہ۔ آپ ایک عظیم الشان سایہ دار درخت کی طرح ہوں گے اور رعیت اس درخت کا تنا ہے، اس کی جڑیں، بیخ و بُن، جس پر درخت کھڑا ہوتا ہے۔ ایک شہنشاہ کے لیے، خوشحال اور مطمئن رعیت اس کا اصل لشکر ہے جو سلطنت کی بھی حفاظت کرے گا اور شہنشاہ کی بھی۔''

قباد نے سیاوش کی طرف دیکھا جو اسے محبت، فکر اور ایک عزم سے دیکھ رہا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں جہاں پناہ... افواج کے رسالدار آپ کا ساتھ دیں گے۔ میں ان سے نہایت رازداری کے ساتھ باتیں کرتا رہا ہوں۔ شاپور مہران، جناب سپاہ بذ مملکت ایرانیان کی بربادی نہیں چاہتے۔ وہ ایک اور شہنشاہ کا تختہ الٹتے دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ آپ کے ساتھ ہیں۔"

پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے تقریباً بے خیالی سے کہا:

"ہمارے پاس بہت سے دوسرے راستے نہیں ہیں۔"

قباد کے دل و دماغ سے شک وشبہ، ہچکچاہٹ کی آخری رکاوٹ اس ایک لمحے میں مٹ گئی۔

"تو... پھر؟" اس نے فیصلہ کر کے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"پرانی تقویم کے مطابق ماہ وزد آنے والا ہے جہاں پناہ۔" مزدک نے کہا: "اس کی پہلی تاریخ کو جشنِ خرم روز ہوگا۔ ایک دن، جب آپ عوام سے باتیں کر سکتے ہیں۔ اس روز آپ اعلان کر دیجیے گا کہ کسان اناج گوداموں پر قبضہ کر لیں۔"

سیاوش کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ اس نے بے اختیار کہا: "یہ بہترین منصوبہ ہے موبد۔" جشنِ خرم روز مملکت ایرانیان کا ایک قدیم سالانہ تہوار تھا اس روز شہنشاہ تخت سے اتر آتا تھا اور سفید لباس پہن کر ایک سفید قالین پر بیٹھتا تھا۔ اس وقت ہر شخص کو اجازت ہوتی تھی کہ اس سے بات کر سکے۔ بادشاہ کسانوں اور دہقانوں سے باتیں کرتا تھا اور ان کے ساتھ مل کر کھاتا پیتا تھا اور اثنائے گفتگو ان سے کہتا تھا کہ آج کے دن میں تمھارے برابر اور تمھارا بھائی ہوں کیونکہ دنیا کا وجود اور قیام زراعت سے ہے اور زراعت حکومت پر موقوف ہے، بس تو زراعت اور حکومت ایک دوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتیں۔ سیاوش نے قباد سے کہا:

"یہ میری ذمے داری ہے کہ اس روز آپ کے گرد صرف وہ سپاہ ہوگی جو آپ سے وفادار ہے۔ وزرگان کو ہم کسی دوسری جگہ مصروف کر دیں گے۔ ہم انھیں وہاں نہ آنے دیں گے۔"

فوجی افسر اور موبد اٹھ کھڑے ہوئے۔ خلافِ معمول قباد بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ سیاوش اور قباد نے بیک وقت بازو پھیلائے اور ایک دوسرے سے گرمجوشی سے بغلگیر ہو گئے۔

"یہ دوست کی دوست سے بغل گیری ہے۔" قباد نے کہا۔ اس نے سیاوش کے رخسار پر بوسہ دیا۔ پھر وہ مزدک کے سامنے خم ہو گیا۔ "معزز، لائقِ صد احترام موبد... میں... آپ کا... مشکور ہوں۔"

وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ مزدک کو موبدِ موبدان کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز کر دے گا، لیکن وہ مزدک کے چہرے کو دیکھ کر جھجک گیا جس پر ایسا سکون تھا جو قباد کو ملکوتی نظر آ رہا تھا۔ وہ انعام و اکرام سے ماورا لگتا تھا۔ یہ کیسی ہستی ہے؟ قباد نے بہت احترام سے سوچا۔ اس کا ساتھ میری خوش بختی ہے۔

چلتے چلتے سیاوش نے کہا: ''عالی جاہ، ان تمام پہریداروں اور منتظمین کو، جنھوں نے آج ہمیں یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے، مع اس کنیز کے، صبح ہونے سے پیشتر خاموش کر دیا جائے۔''

مزدک چونک گیا۔ ''ہرگز نہیں!'' اس نے کہا۔ ''میں بے قصوروں کے قتل و خون کی حکمتِ عملی میں شامل ہونے سے انکار کرتا ہوں۔''

''اُخوہ!! از برائے خدا، موبدِ محترم!!'' سیاوش نے بیزاری سے کہا۔ ''آپ ان معاملات میں دخل نہ دیجیے۔ آپ کو ذرہ برابر علم نہیں کہ معاملاتِ سلطنت کیسے چلتے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ...''

''میں انکار کرتا ہوں!'' مزدک نے مضبوطی سے کہا۔ ''انسان کا خون بہانا بدترین گناہ ہے۔ بے قصور کا خصوصاً... اہورامزدا نے فرمایا ہے۔''

''یہاں اہورامزدا کے اس والے نہیں، کسی دوسرے فرمان کی ضرورت ہے۔'' سیاوش نے تلخی سے کہا۔

قباد نے سیاوش کے شانے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا: ''میں انھیں قیدِ تنہائی میں ڈال دوں گا۔'' پھر اس نے مزدک کی طرف دیکھ کر جلدی سے اضافہ کیا: ''صرف کچھ عرصے تک، موبدِ محترم!''

''اوہ!'' سیاوش نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ مسکرایا اور مزدک کی بانہہ پکڑ کر دروازے سے نکل گیا۔

اب صرف نجومیٔ اعظم کی صلاح باقی تھی۔

اس کے سر پر زربفت کی خوبصورت کلاہ تھی، بیش قیمت حریری لبادہ اور گلے میں سچے موتیوں کی تین لڑیاں تھیں۔ خوبصورت ترشی ہوئی داڑھی، وہ شہنشاہوں اور وزیروں کا مقربِ خاص تھا جو قالین پر لمبے لمبے کاغذ پھیلائے بیٹھا تھا جن پر اس نے دائروں میں مثلث اور مربعے بنائے تھے اور حاشیوں میں پراسرار جدولیں بنائی تھیں جن میں ہندسے درج تھے۔ شہنشاہ غور سے اس کی بات سننے کا مشتاق بیٹھا تھا۔ ان کی مشاورت کے بغیر شہنشاہ اور شہزادگان اور منصب دار کوئی اہم قدم اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے۔

سلطنتِ ایرانیان میں ان کا قدیم کردار تھا۔ ایک سادہ سے تصور پر ان کے علم کی بنیاد تھی کہ چاند، سورج، ثابت و سیار، تارے اور زمین، سب دراصل ایک ہی گوہر سے بنے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔ سورج کا اثر تو سامنے کی بات تھی جس کے بغیر زمین پر زندگی ہی ممکن نہ تھی، نہ نباتات کی اور نہ حیوانات کی، چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا اثر

سمندر کے پانی پر واضح تھا جسے ماہی گیر بھی دیکھ سکتے تھے، لیکن دوسرے ثابت و سیّار بھی گردش میں تھے، یہ زمین سے اور ایک دوسرے سے، اور سورج اور چاند سے نزدیک آتے اور دور جاتے رہتے تھے۔ یہ ایک دوسرے پر اثر ڈالتے تھے۔ زمین پر جو کچھ بھی ہے، نباتات، حیوان، پرندے، مچھلیاں اور انسان، ان کی نظر میں اسی جوہر سے بنی تھیں جس سے چاند سورج اور ستارے بنے ہیں۔ پس تو یہ بھی ستاروں سے مربوط ہیں۔

''لیکن کیا کائنات سے یہ ربط مستقبل کا حال بتا سکتا ہے؟'' فلسفی سوال کرتے۔

''جُملہ رعایتوں کے ساتھ درست حساب کیا جائے تو کیوں نہیں؟'' وہ جواب دیتے۔ شاید لوگ ان کی بات پر یقین نہ کرتے، لیکن ان کی سورج اور چاند کے گرہن کی پیش گویاں اس قدر درست ثابت ہوتی تھیں کہ نہ صرف خواص بلکہ عام لوگ بھی ان کی کھینچی ہوئی زیچوں کی بے حد قدر کرتے تھے، گو عام لوگوں کے پاس نجومیوں پر خرچ کرنے کے لیے فالتو رقم کبھی نہ ہوتی، لیکن وہ خود ستاروں کا تھوڑا بہت حساب کرتے آئے تھے۔ دریائے دجیل پر اپنی چھوٹی، گول ڈونگیوں میں کھڑے ماہی گیر نامعلوم زمانوں سے شہریوں کو بتاتے آئے تھے۔ ''اس رخ پر مچھلیاں بھاری تعداد میں تب آئیں گی جب فلاں ستارہ فلاں برج میں آئے گا!'' اور وہ دریا کے کنارے نرم ریت پر چت لیٹے ستاروں پر نظریں جمائے رکھتے اور ستارے دیکھ کر اپنی ڈونگیاں مشرق یا مغرب کے رخ پر ڈال دیتے۔

شاہی نجومی نے شہنشاہ کے سامنے جھک کر قالین کو بوسہ دیا اور کہا:

''عالی جاہ... میرے زائچے کے مطابق آپ کی عمر طویل ہے۔ خدائے پاک کی رحمتیں آپ پر ہمیشہ سایہ فگن رہیں۔ آپ کی تقدیر میں غیر فطری طور پر جان جانِ آفریں کے سپرد کرنا نہیں لکھا۔ عمر طبعی مکمل کر کے آپ اپنے محل میں آرام دہ بستر پر خالقِ حقیقی سے وصل فرمائیں گے۔''

''ہوں!'' قباد نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ وہ مطمئن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ خدام نے ایک طلائی قاب میں جواہرات شاہی نجومی کی خدمت میں پیش کیے۔

شہنشاہ ایوانِ خاص سے باہر آ گیا۔ وہ ایک نئے سفر کے لیے تیار تھا۔ ایک ایسا سفر جو اس نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ؟ اس نے سوچا۔ کیوں نہیں!! اس نے خود کو جواب دیا۔ وہ اولوالعزم ہے اور زندگی کی توانائی اس کی رگوں میں مچل رہی ہے۔ وہ یہ کر دکھائے گا۔

۱۰

''آؤ، آؤ... بیٹھ جاؤ۔'' شاپور نے خوش دلی سے سیاوش کو مخاطب کیا جو مہمان خانے کی ایک آرام دہ لمبی کرسی کے پاس مودب کھڑا تھا۔ شاپور مہران، خوش مزاج وخوش دل سپاہِ مملکت کا سالارِ اعظم، کل رات ہی اپنے چھوٹے سے قافلے سمیت حیرہ سے واپس آیا تھا۔ تھکن کے باعث وہ جلد سو گیا تھا اور اب غسل کر کے حمام سے نکلا تھا۔ اس نے رومیوں کی طرح ایک لمبی سوتی عبا پہن رکھی تھی جو وہ گھر میں استعمال کرتا تھا وہ ایک نرم پارچے سے جلدی جلدی اپنے بال خشک کر رہا تھا۔

اجازت پا کر سیاوش مودبانہ کرسی کے بالکل کنارے پر بیٹھ گیا۔ کئی دن کی سخت کوششوں کے بعد اسے سپاہ بذ سے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت مل سکی تھی۔

''ہوں! تو جوانمرد... کیسے ہو تم؟''

وہ ایک نرم، ٹیک اور بازوؤں والی مخملیں نشست پر آرام سے بیٹھ گیا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟'' پھر اس نے اپنے خادم سے کہا: ''جاؤ اور بہت اچھا کھانا تیار کرواؤ۔'' اس نے سیاوش کی طرف دیکھ کر ہنس کر کہا: ''چار دن اونٹ کا دودھ پی کر، اونٹ کا گوشت کھا کر اور اونٹ کو دیکھ دیکھ کر لوٹا ہوں۔ اب مجھے اپنی دنیا میں واپس آنے کی ضرورت ہے۔'' پھر وہ اپنی بات پر خوب ہنسا، اور کہنے لگا... ''نہیں نہیں... میں نے کیا کہا؟ وہ بہت اچھے لوگ ہیں — ہمارے اعرابی، بہت مہمان نواز ہیں۔ اور وفادار... میں فوجی معائنے کے لیے گیا تھا۔ ایک پُرشکوہ زبان سن کر آ رہا ہوں۔ نوجوان۔ کیا تم نے عربی سنی ہے؟ بے شک، زبانِ پہلوی کی مانند لطیف وشیریں تو نہیں، مگر اس میں... ان کے ریگزاروں کی ہواؤں کی آوازیں ہیں۔ کیا تم نے کبھی سوچا... زبانوں میں اردگرد کی کچھ آوازیں در آتی ہیں۔ صحرا کی آواز، مقامی پرندوں کی... اور... باغوں کی آوازیں... میں نے سنا ہے... یہ تمھارا موبد، کیا نام ہے اس کا۔ مزدک؟ ہاں، یہی نام ہے۔ وہ زبان کی آوازوں پر نہایت پُرمغز تقریریں کرتا ہے؟''

سیاوش گفتگو کے نئے رخ پر اشتیاق سے آگے جھک آیا۔ یہ دیکھ کر وہ بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا کہ سالارِ اعظم مزدک کا نام نفرت سے نہیں لے رہا تھا۔

''آپ نے صحیح فرمایا۔'' سیاوش نے ادب سے کہا۔

''مجھے میرے بیٹے نے بتایا۔'' پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''سنتے ہو! وہ مزدکی ہو گیا ہے... میرا بیٹا! افوہ! کہتا ہے، مملکتِ ساسان کی ہر شے کو، تمام لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دینا چاہیے۔ یعنی ہمارے محل کو بھی... صاف سن لو، سیاوش، میں اپنی کسی ملکیت کو دینے والا نہیں ہوں۔''

''بندہ پرور، آفتابِ مملکت، مہرِ درخشانِ سلطنتِ ایرانیان، پہلوانِ پہلوانان، حاکمِ حاکمان۔''

''بس بس!'' سالارِ اعظم نے اکتا کر کہا۔ ''تم کہیں کاتبوں کی صحبت میں تو نہیں بیٹھتے؟ انھوں نے کئی صفحات کے القاب لکھنے کی طرح ایجاد کی ہے کیونکہ ان کی اجرت صفحہ کے حساب سے ملتی ہے۔ دس دس صفحات کے القاب لکھتے ہیں اور بات کو اتنا طول دیتے ہیں کہ معمولی سا حکم بھی سپاہ کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔''

''محترم بزرگ!'' سیاوش نے ہمت کر کے کہا: ''وزرگان و موبدان، پایۂ تخت سے غائب ہو رہے ہیں۔''

''ہوں... !'' سالارِ اعظم نے لمبی سانس بھری۔ ''بہت اچھا کر رہے ہیں۔ ان تک پیغام پہنچانا چاہیے کہ اب واپس آنے کی زحمت نہ فرمائیں۔'' شاپور مہران بے چینی سے کھڑا ہو گیا... وہ آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''اس معمولی سپاہ سے، جو انھوں نے اپنی جاگیروں پر پرورش کی ہے، کیا وہ افواجِ سلطنت سے ٹکّر لینے کی ہوا میں تھے؟ میں اس محفل میں شریک نہ تھا جہاں بدانجام، کندۂ دوزخ زرمہر نے شہنشاہ کو میرے منھ میں خاک، ان کو... قتل کرنے کی تجویز پیش کی تھی ورنہ اس کا سر اس کے شانوں پر ایک لمحے کے لیے بھی مزید بار نہ رہتا۔ دیر سے سہی، مگر یہ کارِ خیر سرانجام ہوا۔ افسوس کہ منصب داران ایک نئی شورش پیدا کرنے پر کمربستہ ہوئے۔ کیا ہمارے سامنے دوسرے مسئلے کم ہیں؟ دشمن ہماری تاک میں ہیں۔ قوم ہونان۔ زمینوں پر قبضے کر رہی ہے۔ رومیوں نے اپنی فوجیں سرحدوں پر لگا دی ہیں۔ رعیت بدحال ہے... '' شاپور سوچ میں ڈوب گیا۔ اب اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

''نوجوان... میرے اجداد نے سلطنتِ ایرانیان کو اپنا زندہ خون گرا کر قوتِ بازو سے حاصل کیا ہے۔ وہ میرے اجداد میں سے کوئی تھا جس نے باختریا اور سیستان کو فتح کیا، جس کے نام پر ان زرخیز و شاداب کوہستانوں اور میدانوں میں بہتے ہوئے ایک عظیم الشان دریا کا نام مہران رکھا گیا۔ ہم روزِ ازل سے شہنشاہان کے دست و بازو رہے ہیں۔ کیونکر ہم اس سلطنت کی بربادی برداشت کر سکیں گے؟ اور یہ... موبد مزدک... یہ اپنے آپ کو خدائے پاک کا پیغمبر کہہ رہے ہیں۔ تو... ان کا دین...''

''جناب عالی... دین وہی ہے جو ہمارا دین مقدس ہے۔'' سیاوش نے جلدی سے کہا۔ ''ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کی کاملیت کے لیے کوشاں ہیں۔''

''خیر! کچھ بھی ہو۔'' شاپور مہران نے ہاتھ اٹھا کر سیاوش کو خاموش کر دیا۔ ''وہ رعیت میں مقبول ہیں۔ رعیت کو ساتھ لیا جائے اور سلطنت کو مستحکم کیا جائے... اس میں کیا قباحت ہے؟ اگر ان کا دین سلطنت کو استحکام دینے میں مددگار ہے، تو ہم اس کو تحفظ دیں گے۔ ضروری ہیں وہ دین جو سلطنت کو استحکام دیں اور اس کی توسیع کریں۔'' اب وہ اپنے خیالوں کی رو میں بہہ رہا تھا۔ اس نے کہا: ''نوجوان... دین اور سلطنت ایک ہیں۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ دین دراصل سلطنت کی شان و شوکت کی علامت ہے۔ ارے نہیں، یہ میں نے کیا کہا، میرا مطلب ہے کہ سلطنت بذاتِ خود، دین کے جاہ و جلال اور کرّ و فر کا شاندار مظہر ہے۔''

پھر اس نے اچانک پوچھا: ''کیا موبد مزدک، مانوی ہیں؟''

''نہیں جناب عالی!'' سیاوش نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک مجھے علم ہے موبد مزدک مانوی نہیں۔''

''خیر... ! اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' شاپور نے دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ ''مملکت کے ایک شہنشاہ! میرے ہم نام شاپور اوّل نے مانی کو پورا تحفظ دیا تھا۔ شہنشاہی سرپرستی میں مانویت پھلی پھولی۔ دور دور تک جا پہنچی۔ حیرہ کا عرب بادشاہ عمرو بن عدی بھی مانویوں کی حمایت کرتا تھا۔ اور سلطنت کو اس کا فائدہ تھا، حیرہ کے تعلقات فارس سے مضبوط ہو رہے تھے... تو دین تو اے پسرِ عزیز، سلطنت کے لیے ہے۔ اب قسطنطنیہ کو دیکھو! یسوعیت سے مملکت کو مضبوط کر رہا ہے، ورنہ...'' اس نے دبی آواز میں کہا اس بیچارے کو تو انھوں نے... کیا کہتے ہیں کہ... ٹانگ ہی دیا تھا، اور یہ بھی نہ بھلانا میرے دوست کہ قسطنطنیہ پر یسوعی ہو جانے کا کشف کب ہوا؟ عین میدانِ کارزار میں... بس نظر آ گئی صلیب بادلوں میں... اور آواز آئی، کہ جنگ جیتنا ہے تو یسوعی ہو جاؤ، اور وہ ہو گیا یسوعی۔ پھر دین افواج کے کام آیا... آیا کہ نہیں؟''

نوجوان سالار سیاوش ادب سے ایک طالبِ علم کی طرح ہمہ تن گوش اپنے اعلیٰ ترین افسر کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا:

''کیا حاکم حیرہ اب بھی مانوی ہیں؟''

''کون؟ منذر؟ ان کا شاہ؟ نہیں... وہ مانوی نہیں — نوجوان — تم کو پتہ ہے؟''

اس نے اپنی نئی دریافت کو جو اسے اس دورے میں حاصل ہوئی تھی، اشتیاق سے نوجوان افسر کو بتانا شروع کیا: ''حیرہ کے جنوب کے باشندے بت پرست نہیں ہیں۔ وہ کسی دینِ حنیف کے

پیرو ہیں اور ہماری طرح خدائے پاک پر یقین کرتے ہیں، گو وہ اس کو کچھ اور کہتے ہیں۔ کوئی لفظ، جو میرے ذہن میں ہے مگر زبان پر نہیں آ رہا۔ وہ عبرانیوں کے 'الاھیوم' سے بہت مماثل ہے۔ وہ ہماری طرح یقین کرتے ہیں کہ خدائے پاک نور ہے ... اور نور سے یاد آیا۔ حیرہ میں سبائیوں کا قافلہ آیا ہوا تھا۔ وہ بہت اعلیٰ خوشبودار لکڑیوں کے تاجر ہیں۔ میں نے ان سے پورا ایک گٹھا خریدا ہے۔ تم کو بھی دوں گا۔ اسے اپنے دوست موبد مزدک کو دینا۔ آتشِ مقدس پر ڈالیں گے تو ان کا آتش کدہ معطر ہو جائے گا۔''

''بہت بہتر!'' سیاوش نے سر جھکا کر کہا۔

''ہاں تو میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سبائی، ہمارے مقدس دین کی مانند، اقلیم نور وظلمت اور ان کی کشاکش مستقل پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ لہراسپ نے مجھے بتایا۔ وہ کافی عرصے وہاں رہا ہے اور ان کی صحرائی زبانیں جانتا ہے۔ بڑی حیرت ہوتی ہے جب اس کی آریانی زبان بے تکلّف ان کی آوازوں پر مڑتی چلی جاتی ہے... ہا ہا ہا۔'' وہ ہنسا— ''تو وہ ان کے تجارتی قافلوں سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ان کا نور وظلمت کی کشاکش پر عقیدہ بالکل ہم جیسا ہے۔ میں تو ان کو اپنے دین میں شامل سمجھتا لیکن وہ تقدیس وتمجیدِ آتش نہیں کرتے۔ لہراسپ کا کہنا ہے کہ ان کی سلطنت میں، ہاں ایک چھوٹی سی سلطنت بھی ہے ان کی، ہمارے ایک چھوٹے صوبے کے برابر... وہاں مقدس آتش کدے کی جگہ ایک عمارت ہے جس کو وہ مقدس کہتے ہیں۔ یہ ایک چوکور عمارت ہے اور اس میں شاید ایک سیاہ پتھر بھی ہے۔ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو دیکھا نہیں۔ لیکن یہ تو بتایا جا سکتا ہے کہ ہماری طرح ان کی بھی ایک کتابِ مقدس ہے۔''

سیاوش اب جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سوئے ادب تھا کہ وہ سالارِ اعظم کے عندیہ ظاہر کرنے سے پہلے چلا جائے۔ وہ قطعی مطمئن ہو چکا تھا کہ سالارِ اعظم اور افواجِ ایرانیان اس کے دو گہرے دوستوں، مزدک اور شہنشاہ قباد کو نقصان نہ پہنچائیں گے اور ان کے ساتھ تعاون کریں گے۔ شاید شاپور اسے چلے جانے کا اشارہ دیتا لیکن اسے کچھ یاد آیا۔

''سابیان کا موبدِ موبدان... وہ لوگ اسے مقرّب کہتے ہیں، وہی ان کا شاہ تھا۔ موبدوں کا شہنشاہیت سے کیا واسطہ؟ کیوں نوجوان... موبدان نے زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ میں اپنا کوئی سالار تک ان کی مرضی کے بغیر متعین نہیں کر سکتا۔ کاروبارِ سلطنت ان کی عقل سے ماورا ہے، پھر بھی دخل اندازی سے باز نہیں رہتے۔ جب کہ اپنا سارا وقت یہ قرض وصول کروانے اور سود دَر سود کا حساب کروانے میں گزارتے ہیں۔ جبکہ... نوجوان...''

اس نے داڑھی میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: ''اگر بہ نظرِ غور دیکھیں تو... موبد... ان کو دین کی تسلیم شدہ روایات کے مطابق... کاروبار اور تجارت کی اجازت نہیں ہے۔ یہ لوگ ہر کام دین کے خلاف کر رہے ہیں... یہ موبدان...''

''جی!'' سیاوش نے اشتیاق سے سر ہلایا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ قرض دینے اور اس پر منافع لینے کا رواج آتش کدوں سے شروع ہوا تھا۔ موبدان کے پاس وزرگان کے گراں قدر نذرانوں اور غریب غربا کے چھوٹے موٹے چڑھاوؤں سے اتنی دولت جمع ہو گئی تھی، اور اتنا مال و اسباب کہ انھوں نے اوّل اوّل تجارتی قافلوں کو دوسرے شہروں اور مملکتوں میں فروخت کرنے کے لیے اناج قرض دینا شروع کیا تھا۔ وہ منافعے کا ایک حصّہ خود لینے لگے تھے۔ پھر چھوٹے دکانداروں اور مزدوروں کو اناج یا سکوں کے قرضہ جات کا آغاز ہوا۔ اس میں مقروض کا نفع نہ ہوتا تھا، لیکن اضافی مال ان سے لینا ضروری تھا۔ اگر مہرداد کا گھر جل گیا اور اس نے دوبارہ گھر بنانے کے لیے قرض لیا تو اسے وہ مع سود ہی واپس کرنا تھا۔

''وہ کیوں؟'' مہرداد پوچھتا۔

''کیونکہ تم کو منافع ملے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''تم گھر بناؤ گے، اس میں رات کو آرام سے سوؤ گے۔ صبح کام پر جاؤ گے۔ تم کماؤ گے۔ تم کو فائدہ ہوا یا نہیں؟''

غریب مہرداد، جو معمار تھا، یا کسان، یا کان کن، وہ اس دانشِ منطق کے سامنے لاجواب ہو جاتا۔ وہ قرض لیتا اور پھر تا عمر موبد کا غلام بن جاتا۔

بالکل اسی طرح سلطنتِ رومیہ میں کلیساؤں سے وسیع پیمانے پر قرض دیے جا رہے تھے۔ موبد اور کلیسائی پیشوا غریبوں کو قرض دیے جا رہے تھے۔ روحانی پیشوا غریبوں کو قرض دیتے اور ساتھ ہی منصب داروں اور وزرگان کو، اور شہنشاہوں کو قرض دیتے کیونکہ بے حد و حساب اصراف کے باعث ان کے خزانے اکثر خالی ہو جاتے تھے۔ شاپور مہران نے کہا: ''ان موبدوں کی طاقت کو توڑنا ضروری ہے۔ جس وقت دشمن سے صلح کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ہمیں جنگ پر مجبور کرتے ہیں، اور جب جنگ لازمی ہوتی ہے اس وقت ان کے پروردہ اور تابع سالاران کے کہنے پر دشمن سے بے ہنگم معاہدے کر لیتے ہیں۔ اب میں سوگند پینے کو تیار ہوں، یا انگاروں پر چل کر اپنی سچائی ثابت کر سکتا ہوں کہ قوم ہونان سے زرمہر نے جو معاہدہ کیا وہ یکسر غلط تھا، نقصان دہ تھا... باعثِ تذلیل تھا...

موبدان نے ہونان سے رشوت لی تھی۔ اور اب جبکہ رومی نصیبین جیسے شہرِ درخشاں پر دانت لگائے بیٹھے ہیں تو موبدان قومِ ہونان سے جنگ پر مُصر ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اصل اور بڑا دشمن کون ہے؟ یہ چھوٹے موٹے ہونان؟ یا رومیوں کی سلطنتِ قاہرہ؟ اصل خطرہ تو اُن سے ہے۔ ہونانوں کو تو میں اپنی فوج کا ایک دستہ بنا لوں...'' اس نے جوش میں کہا۔

سیاوش سوچ رہا تھا کہ قومِ ہونان جن کے وحشیانہ حملوں نے سلطنتِ ساسان کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اتنے ''چھوٹے موٹے'' بھی نہ تھے۔ لیکن... یہ سچ تھا کہ ان سے صلح کر کے رومیوں کا مقابلہ زیادہ آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ یہ دانش تھی۔ شاید یزدان حرکت میں تھا۔ شاپور مہران اب تک موبدان کے نازیبا کردار میں گم تھا۔ وہ اچانک چہک کر بولا:

''ایک محفل میں، ملے تھے مجھ سے موبدِ موبدان اور ان کے عبرانی حساب دان... موبدِ موبدان کائناتی قوتوں پر عالمانہ تقریر فرما رہے تھے۔ ذرا تصور تو کرو اس نے کیا کہا؟ کہنے لگا۔ بے شک کائنات میں بہت قوتیں ہیں جو کام کرتی ہیں لیکن سب سے بڑی قوت کو تو آپ جانتے ہی ہیں، یہ اس نے موبدِ موبدان سے کہا تھا، سب سے بڑی کائناتی قوت تو ہے سود در سود۔ ہاہاہا۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر اچانک سنجیدہ اور افسردہ ہو گیا۔ ''غربت کی جڑ...'' اس نے کہا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

قیمتی تھیلوں میں لپٹے ہوئے تحفوں کے ساتھ سیاوش اس کے شاندار محل سے رخصت ہوا۔

۱۱

خرم روز کی تقریب میں، شہنشاہ، فاقہ زدہ کسانوں کے درمیان۔ اس کے سفید قالین سے کچھ دور سیاوش ایک چاق و چوبند فوجی دستے کے ساتھ موجود تھا۔ اور ان کے درمیان مزدک، ایک اجلی سفید قبا میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ تقریباً مراقبے کے عالم میں تھا۔

''اے خدائے پاک! اے اہورامزدا! خدائے بزرگ و برتر، اے پاک پروردگارِ کائنات۔ مجھے ہمت دے، اے اہورامزدا — مجھے طاقت دے کہ میں ثابت قدمی سے وہ کچھ کہہ سکوں جو میرے دل و دماغ میں بالکل صاف صاف آ رہا ہے۔ کیا یہ تیرے ہی بھیجے ہوئے خیالات نہیں؟ ہاں یہ تیرا ہی نور ہے۔ یہ تیرا پیغام ہے۔ یہ تیری امانت ہے۔''

اس کی آنکھیں سختی سے بند تھیں اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی سے تین لمبی لمبی سانسیں لیں۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا چہرہ پُرسکون تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بلند کیا۔ مجمعے پر خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سننے کو تیار تھے۔

''ہاں میں مزدک — میں خدائے بزرگ و برتر کا پیغام بر ہوں۔ میں تمھارے پاس خدا کا پیغام لایا ہوں اسے غور سے سنو۔''

مجمعے سے حیرت کی دبی ہوئی صدا بلند ہوئی۔

''مرے بیدار خواب میں پیامبرِ افضل زرتشت آئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے، خدائے ہر دو جہاں نے اپنی بے مثل رحمت و برکت سے روئے زمین پر زندگی کے وسائل پیدا کیے تاکہ سب یکساں طور پر ان سے فائدہ اٹھائیں اور کسی کو دوسرے کی نسبت زیادہ حصہ نہ ملے۔''

لوگ دم بخود۔

''لیکن لوگوں میں زبردستی کے ذریعے نابرابری پیدا کی گئی اور یہ اہرمن کی کارستانی تھی۔ اس کے شر کے بس میں آ کر ہر شخص نے یہ کوشش کی کہ دوسرے کا حصّہ چھین کر اپنی خواہشات پوری کرے۔ دنیا میں جتنا دکھ ہے وہ اسی نابرابری کی وجہ سے ہے۔ اس کے لیے لوگ آپس میں لڑتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، چوری کرتے ہیں، ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ اسی نابرابری کے باعث انسان روئے زمین پر ہزاروں برس سے خوار ہے۔'' زرتشت نے کہا۔

ہزاروں آنکھیں مزدک کے چہرے پر گڑی تھیں، ہزاروں کان اس کی آواز پر لگے تھے۔

''نابرابری مزید نابرابری کو پیدا کرتی رہتی ہے۔ حرص کی تکمیل آسودگی نہیں دیتی، یہ لامتناہی سلسلہ بن جاتی ہے مزید حرص کا۔ یہ اہرمن کی رضا تھی۔ خدا کی نہیں، جو محبت، امن اور حسن ہے، جو نور ہے۔ خدا نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حصہ لینے کا حق کسی کو نہیں دیا۔'' زرتشت نے کہا!

مجمعے پر سناٹا طاری تھا۔ اب مزدک کی آواز پہلے سے زیادہ بلند اور پُراعتماد تھی۔

''اس لیے یہ ضروری ہے کہ امیروں سے دولت چھین کر غریبوں کو دی جائے اور اس مساوات کو دوبارہ قائم کیا جائے جو ابتدائے آفرینش میں نوع انسان میں تھی۔'' زرتشت نے کہا۔

مزدک کو آوازوں کا ایک مدھم سا شور کہیں دُور سے سنائی دے رہا تھا اور آنکھوں کو صرف ایک دھند نظر آ رہی تھی۔

''ہاں! میرے دوستو، اسے لکھ لو اور یاد رکھنا... مبادا کل دنیا کہے کہ کسی پیغمبر نے... کیا آریانی اور کیا عبرانی، بندگانِ خدا کو اس کا اصل اور آخری پیغام نہیں دیا۔''

اب پھر اس کے سامنے اطراف کے خطوط واضح ہو گئے۔ اس نے پرسکون آواز میں کہا:

''مال و دولت کو اس طرح مشترک بنانا چاہیے۔ جس طرح کہ پانی اور آگ اور چراگاہیں ہیں۔ ایسا کرنا ثواب ہے، جس کا خدا نے حکم دیا ہے اور اس کا وہ نہایت عمدہ اجر دے گا۔ جب کسی قسم کی قیود نہ رہیں گی تو لوگوں کی باہمی امداد خدائے پاک کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہوگی۔''

مجمعے پر سناٹا طاری تھا، ان سے کچھ فاصلے پر بھوکے ننگے کسانوں، ہر طرح کی مشقت کرنے والوں، اہلِ حرفہ اور دوسرے شہریوں کا بہت بڑا غول حیرت اور بے اعتباری سے مزدک کا پیغام سن رہا تھا، جو شاہی چوبدار اُن کے لیے باآوازِ بلند دُہرا رہے تھے۔

اب مزدک شہنشاہ قباد کی طرف مڑا اور اس نے کہا:

''شہنشاہِ عالم کیا آپ کو منظور ہے؟ کیا آپ خدا کے حکم پر چلیں گے اور اپنی رعیت کو چلائیں گے؟''

قباد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا:

''اے پیغمبرِ خدا، میں خدا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔'' پھر اس نے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا: ''میں آپ کا بھائی ہوں، جب کہ آپ بھوکے ہیں تو آب و دانہ میرے لیے زہر کی مانند ہے۔ میں، مملکتِ ایرانیان کا شہنشاہ جو اس سرزمین کے ذرّے ذرّے پر مکمل اختیار اور قوت رکھتا ہے، آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ امراء کے گوداموں سے، ابھی اور اسی وقت اپنے اور اپنے

معصوم بچوں کے لیے خوراک لے لیں۔''

وہ قباد کے الفاظ تھے، خدا کے نہیں، دنیوی قوت، جبروت اور اختیار کے، جنھوں نے خدائی احکام سے پیدا ہونے والی بے انتہا امید اور آنسو بھرے آسرے کو ٹھوس یقین میں بدل دیا۔ مجمعے کا رنگ بدل گیا۔ اب پیلے پڑے ہوئے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ بازو فضا میں لہرا رہے تھے۔ جسم امنگ سے اچھل رہے تھے۔ اب ایک شور اٹھ رہا تھا۔

''شہنشاہ قباد — جہاں پناہ قباد — زندہ باد، زندہ باد، زندہ و پائندہ باد!''

سیاوش اور فوجی دستے کی معیت میں فاقہ زدوں کا پہلا غول امراء کی حویلیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پہریدار انھیں کچھ نہ کہہ سکے۔ اپنی سنگینیں اور تلواریں جھکائے وہ ایک طرف کو ہو گئے۔ تالے توڑ دیے گئے۔ ایک محل کے، پھر دوسرے پھر تیسرے۔ ڈھل ڈھل ڈھل، اناج پھٹی ہوئی جھولیوں میں گر رہا تھا۔ گیہوں، جَو، دور دراز کے صوبوں سے منگوایا ہوا ریشمی چاول، مکئی، دالیں۔

کسان اپنی جھونپڑیوں کی طرف برتن لینے بھاگ رہے تھے، وہ اپنی بیوی بچوں کو ساتھ لا رہے تھے۔ وہ اپنے چولھوں میں مقدس آگ روشن کر رہے تھے اور اس کے سامنے سجدہ ریز تھے۔

اے آگ! تو مقدس ہے۔

اے ہر شے کو پاک کرنے والی مظہرِ خداوندی۔

تو بادلوں میں بجلی ہے، تو سورج میں تپش۔

تو ہمارے جسموں میں حرارت ہے، تو زندگی کی علامت۔

حرارت، جو جنگلوں کی مقدس نمی سے آمیخت ہوتی ہے تو مردہ، سیاہ مٹی میں جان ڈال دیتی ہے، اور پھوٹتی ہے ایک نئی کونپل — نئی نکوری — جو پہلے وجود نہیں رکھتی تھی۔ تو لامحدود ہے۔ اہورامزدا کا پرتو!

ثنا! ثنا! سب تعریف اہورامزدا کے لیے...!

جھونپڑیوں سے زمزمے بلند ہو رہے تھے۔

۱۲

لق و دق، افق کی لکیر تک پھیلے ہوئے جھاڑیوں بھرے میدانوں میں سالارِ اعظم گشتاسپ پا بہ رکاب تھا۔ اس کا نہایت عمدہ نسل کا گھوڑا پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور سُم زمین کو بہ مشکل چھوتے اُڑے جا رہے تھے۔ گشتاسپ کی رانیں گھوڑے کی کمر میں پیوست، راسیں دونوں ہاتھوں میں، وہ اتنا آگے جھکا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ گھوڑے کی تیز ہوا میں اڑتی ایال میں گھسا جا رہا تھا۔ گھوڑا اور سوار ہوا کو ایسے چیرتے ہوئے بڑھ رہے تھے کہ مٹی بھری ہوا کے زناٹے دار تھپیڑے ان کے منہ پر پڑ رہے تھے۔ اس وقت، ایسا لگ رہا تھا کہ گھوڑا اور سوار دونوں مل کر ایک ہو گئے ہوں اور اب وہ نا قابلِ یقین تیز رفتاری سے، متحرک طاقت کا ایک پیکر بن گئے ہوں۔

اور اس سے چند فرسخ کے فاصلے پر اس کے تعاقب میں برزین اتنی ہی طاقت اور تندی سے گھوڑا دوڑاتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے بال وحشیوں کی طرح اُڑ رہے تھے، اس کی ایڑیاں گھوڑے کے جسم میں گھسی ہوئی، اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے، وہ ایڑی سے گھوڑے کو بار بار تیز، اور تیز دوڑنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میدان ان دونوں راکبوں کی ٹاپوں سے گونج رہا تھا۔

''برزین!'' گشتاسپ نے چلّا کر کہا۔ ''میں آذر گشتاسپ ہوں! میرے نام کا مطلب جانتے ہو؟ سلطنت کے جاہ و جلال، سپاہ کی قوتِ قاہرہ کی آگ!''

ہوا سیدھی یہ آواز برزین تک لے آئی۔ آواز اس کے منہ میں اور کانوں اور ناک میں اڑتی ہوئی خاک کی طرح گھسی۔

''اور میرا نام آذر برزین ہے۔'' برزین نے پوری طاقت سے چلّا کر کہا۔ ''اس کا مطلب جانتے ہو؟ کسانوں کی آگ! میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کی آواز مٹی بھری ہوا میں تحلیل ہو گئی، کہیں بہت پیچھے میدانوں میں چلی گئی۔ گشتاسپ نے کمر موڑ کر اپنی کمان کو کان تک کھینچا اور زہر آلود تیر تیزی سے اڑتا ہوا برزین کے گھوڑے کی پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ پھر ایک اور، جو گھوڑے کے گلو کے پار ہو گیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنا کر الف ہوا اور زمین پر گر گیا۔ برزین بمشکل گھوڑے کے وزن کے نیچے سے نکلا۔ گھوڑے کی تھوتھنی کے گرد زمین پر خون ہی خون تھا۔

''نہیں! نہیں!'' برزین چلایا۔ اس نے گشتاسپ کی سمت دیکھا جو بہت دور نکل چکا تھا اور

تیزی سے افق پر ایک نقطہ بنتا جا رہا تھا۔ گھوڑے نے دو تین پچھاڑیں کھائیں اور دم توڑ دیا۔ برزین گھوڑے کے جسم سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگا۔ پھر اس نے چہار سُو نظر دوڑائی۔ حدِ نگاہ تک ویران میدان خالی پڑا تھا۔ کسی ذی روح کا نشان تک نہ تھا۔ برزین کھڑا ہو گیا۔ ''اب میں کیا کروں گا!! یہاں تو کوئی بھی نہیں... '' اس نے بے حد فکرمندی سے سوچا۔ وہ پوری طاقت سے بھاگنے لگا اور ایک جھاڑی میں الجھ کر گر گیا۔ برزین زمین پر بیٹھ گیا۔ کاش کوئی جانور نظر آ جائے جس کی پیٹھ پر وہ سوار ہو سکے... کوئی گائے نظر آ جائے... اس کی نگاہیں چہار سُو کسی سواری کا نشان ڈھونڈ رہی تھیں۔

برزین کو اس کے دادا نے بتایا تھا کہ بہت قدیم زمانے میں چند انسان ایک عجیب الخلقت گائے سرس وگ کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس دنیا سے چلے اور باقی آسمانی کشوروں کو طے کیا جہاں کوئی شخص کسی اور ذریعے سے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک رات جب وہ عین سمندر کے بیچ میں جا رہے تھے تو ہوا نے ان تین آگوں کو جو گائے کی پیٹھ پر جل رہی تھیں، سمندر میں گرا دیا۔ لیکن وہ آگیں تین جانداروں کی مانند پھر سے اسی جگہ گائے کی پیٹھ پر نکل آئیں جہاں وہ پہلے جل رہی تھیں۔ اپنے اوپر چھائی ہوئی مایوسی سے گویا کشتی لڑتے ہوئے وہ زور سے چلّایا:

''ماں! اے میری مادر... !''

''ارے ارے... کیا ہو گیا۔'' برزین کی بیوی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ برزین نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ وہ کہاں تھا؟ چند لحظوں تک اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے اپنی چٹائی کے بستر اور کچے گھروندے کی دیواریں نظر آئیں۔ اس کے تینوں بچے ایک دوسری چٹائی پر سو رہے تھے۔

''اچھا... تو یہ خواب تھا!'' برزین نے سوچا۔ اس نے بیوی سے پانی منگوا کر پیا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیوی سے کہا: ''میں نے خواب دیکھا ہے۔''

''خواب؟ کیا خواب تھا؟ تم ڈر گئے تھے۔ مجھے بتاؤ''

''تم کو؟ نہیں۔ تم معبر نہیں ہو۔ خواب... ہر ایک کو نہیں بتانے چاہییں... مجھے پیغمبرِ محترم مزدک کے پاس جانا ہے۔ کل ہی۔''

''میں 'ہر ایک' ہوں؟ میں؟''

''نہیں... تم ہر ایک نہیں ہو۔'' برزین اپنی کسی کسائی بیوی سے لپٹ کر بستر پر گر پڑا۔ ''تم تو میری قزبانو ہو... زنِ پادشائی! ہاہاہا... '' وہ ہنسا۔ ''ہم غریبوں کی بھی زنِ پادشائی ہوتی ہے کیا؟ ہاں، کیوں نہ ہو!''

پھر اس نے کہا: ''میں نے خواب دیکھا... کہ میں سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہوں... نہیں، میں گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اور میں کمان کھینچ کر تیر چلاتا ہوں، مگر دوسرے رخ پر چلتی ہوا کے زوردار جھکڑ میں تیر پیچھے کی طرف اُڑ جاتا ہے... جبکہ...'' وہ زور سے ہنسا، ''مجھے گھوڑے پر سواری کرنی نہیں آتی اور نہ تیراندازی آتی ہے... مگر مجھے بالکل محسوس ہو رہا تھا کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ راس کھینچ رہا تھا میں۔ اب تک ذہن میں صاف ہے۔ وہ کمان کا کھنچاؤ، اور تیر کا چلّے کو چھوڑنا...!'' برزین نے حیرت سے کہا۔

اس کی بیوی نے فکرمندی اور محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''پریشان مت ہو۔'' اس نے برزین کو پھٹی ہوئی چادر اڑھائی۔ پھر خود بھی اس کے اندر گھس گئی۔ دیوار پر ان کے آتش خانے کی روشنی کھیل رہی تھی۔ اس نے برزین کے گھنے گھنگریالے بال سہلائے اور کہا: ''خواب کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔''

''تمھیں کس نے بتایا؟'' برزین نے بے چینی سے پوچھا۔

''میرے نانا کہتے تھے۔''

''نانا! اچھا!'' برزین نے کہا۔ اسے اطمینان محسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ بزرگوں کی کہی ہوئی بات درست ہوتی ہے۔ جو اُن سے بھی زیادہ بزرگ ہیں، یا وہ جو اب نہیں رہے، ان کی دانش تو اور بھی زیادہ تھی۔ وہ نیم شعوری طور پر محسوس کرتا تھا کہ علم اور دانش ایک نسل سے دوسری نسل تک پوری طرح منتقل نہیں ہوتی۔ انسان محض تھوڑی سی دانش اور علم اپنے بچوں کو دے پاتا ہے۔ بہت سی باتیں بیچ میں رہ جاتی ہیں، پیچھے چھوٹ جاتی ہیں۔ بہت کام کی باتیں مرنے والوں کے ساتھ فراموش کر دی جاتی ہیں۔ جس طرح آج کل جب کان کن بوریوں میں اناج بھر کر لاتے تھے تو کتنا ہی راستے میں گرتا جاتا تھا۔ مٹی اور ریت میں دب جاتا تھا۔ جنھیں بہت ضرورت تھی، صرف وہ ہی واپس جا کر ان دانوں کو مٹی میں ڈھونڈتے تھے اور بین کر گھر لے آتے تھے۔ زیادہ تر کان کن انھیں بھلا دیتے تھے۔ انھیں جلدی ہوتی تھی کہ جتنا کچھ گھر پہنچا اسے پیس کر روٹی پکائیں، یا پھر دوسرے دن نئے دانے لائیں۔ برزین کے تصور میں انسان زمانوں کے علم اور دنیا کی دانش ایک بوری میں بھرے، اپنی پیٹھ پر لادے جا رہا تھا۔ بہت سی علم و دانش ضرور سب کی بوریوں سے راستے میں گر گئی ہوگی۔

وہ اپنی بیوی کا بدن سہلاتا رہا جو تین بار منصب داروں کی خدمت کر کے آئی تھی اور ان تین بچوں میں جو لڑکی تھی اس کا باپ تو ایک مرزبان تھا۔ اس نے بیوی کی گردن میں منھ چھپا لیا۔ پھر اس

کی نظر دیوار پر لٹکے اپنے اوزاروں پر پڑی۔ ایک چھینی اور ہتھوڑا، مٹی کے گڑھے میں جلتی ذرا سی آتش خانے کی روشنی ان پر پھیلتی اور سمٹتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ آگ کی بھڑکتی روشنی میں یہ عکس ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ برزین کو دِرفش کاویانی کا خیال آیا۔ وہ بھی تو ایک لوہار کا پرچم ہے، ایک آہنگر کا، جس نے ظالم ضحاک کو شکست دی تھی، جو ہر روز دو جوانوں کا مغز نکال کر اپنے پھوڑوں پر ملتا تھا۔ آہنگر کے لشکر نے اسے ہرا دیا تھا اور آریانان کو اس کے ظلم سے نجات دلا دی تھی۔ لیکن پھر... اسے خیال آیا۔ پھر آہنگر نے اشکانی شہزادہ فریدوں ڈھونڈ نکالا اور اسے تخت پر بٹھا دیا... کیوں؟ وہ خود تخت پر کیوں نہ بیٹھا؟ اگر کاوہ تخت نشین ہو جاتا... تب کیا ہوتا؟ تب لوہار شہنشاہ بن جاتا... وہ لوہار نہ رہتا... کیا وہ یہی چاہتا ہے؟ نہیں، یہ تو نہیں! کوئی دوسرا طریقہ... کچھ سوچیں گے...

برزین نے اپنے بازوؤں میں ایک نامانوس قوت محسوس کی۔ وہ بیوی سے پیار کرنے لگا اور اس کے کانوں میں، ہانپتی سانسوں میں پُرزور سرگوشیاں کرنے لگا: ''تم میری ہو! میری ہو تم!'' یہاں تک کہ اس کی بیوی نے حیرت سے کہا: ''ارے بھئی ہاں۔ کیا میں نے کہا کہ میں تمھاری نہیں ہوں؟'' برزین ٹھٹک گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر عورت کی گردن میں منھ گھسا کر وہ آواز دبا کر دیر تک ہنستا رہا۔ واقعی! وہ اپنی بیوی کو کیا سمجھ رہا تھا؟ کیا زمین کا سکھ چین۔؟
کان کن اور اس کی بیوی رات کے آخری پہروں میں دوبارہ سو گئے۔

۱۳

مقدس دینِ زرتشت کا ہر پیرو اس بات سے واقف تھا کہ انجام کار روزِ حساب آنے والا ہے۔ جب دنیا ختم ہو جائے گی اور تمام مردے اٹھائے جائیں گے۔ دین زرتشت بتاتا تھا کہ قیامت اس طرح آئے گی کہ دمدار ستارہ ''گوچہر'' زمین پر آ کر گرے گا اور اس دھماکے سے زمین پر ایسی آگ پھیل جائے گی جس کی شدید گرمی سے تمام دھاتیں پگھل کر ایک آتشیں سیلاب بن جائے گا اور تمام دنیا پر پھیل جائے گا۔ یہ قیامت کا دن ہوگا۔

لیکن قیامت تو آ چکی تھی۔ روزمہر کے قصر میں، اور طیسیفون کے لاتعداد محلوں میں... روزمہر کا خاندان، اس کی دو حسین، نوجوان، نازک اندام بیٹیاں، اس کی عمر رسیدہ زنِ پادشائی، متعدد زنِ چگاریاں، درجنوں خانگی غلام اور خدمت گار، قصر کے اندرونِ خانہ گول گھومتی سنگ سرخ کی سیڑھیوں پر لرزہ براندام قطار میں کھڑے تھے، جو اوپر روزمہر کی مزین خواب گاہ تک جاتی تھیں۔ نیچے بدحال میلے کچیلے کسانوں، مزدوروں، کان کنوں کا غول اس کے آراستہ و پیراستہ مہمان خانے کا اسباب لوٹ رہا تھا۔ وہ شور مچاتے ہوئے غلیظ انگلیوں سے بیش بہا آرائشی نوادرات کو اُلٹ پلٹ رہے تھے، جن کی قدر و قیمت کی انھیں کچھ خبر نہ تھی اور انھیں اچھال اچھال کر اپنے لمبے لمبے تھیلوں میں بھر رہے تھے جو ان کی بیویوں نے جلدی جلدی سیے تھے۔

ایک بڑھئی نے سیڑھیوں پر نظر ڈالی اور لپکتے ہوئے آگے بڑھ کر روزمہر کی بیٹی کی کلائی پکڑ لی۔

''اسے میں لوں گا۔'' اس نے بھرّائی آواز میں کہا۔ ''یہ میری زوج بنے گی۔''

روزمہر پورے قد سے غصّے سے تھرتھرایا۔ ''چھوڑ دو اس کا ہاتھ! کمین لوگو... تم میرے گھر میں گھس آئے ہو اور میری ناموس پر ہاتھ ڈال رہے ہو!''

برزین ایک ستون سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھ آیا۔ اس نے کہا:

''روزمہر... خدمت گار بیویوں سے پیدا ہونے والی تمھاری بیٹیاں تو غریبوں کے گھروں میں ہیں۔ کیونکہ تمھارا قاعدہ ہے کہ ایسی اولادوں میں صرف بیٹوں کو تمھارے گھروں میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ ایک مرزبان کی بیٹی تو اب میری بیٹی ہے۔ پھر اتنا شور و غوغا کیوں؟''

''خاموش!'' روزمہر نے قہر سے کہا۔ ''یہ شرفا کی مسلمہ رسم ہے۔ تم سوچنے کی صلاحیت رکھتے

توسوچتے کہ میرے ذاتی گھر میں گھس آنا کس قدر بڑا گناہ ہے۔ بدبخت دوزخی!''

اب تک کردکان کن تذبذب میں تھا۔ جو کچھ ہورہا تھا وہ نہ جانے کیوں اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔لیکن روزمہر کی یہ بات سن کر، اور اس کی غدّار زرمہر سے رشتہ داری یاد آنے پر وہ برافروختہ ہوگیا۔اس نے کہا:

''روزمہر... صدیوں سے تم نہیں، بلکہ تمھارے حقیر ملازم، بالکل اسی طرح ہمارے گھروں میں گھستے آئے ہیں۔ وہ سنگین کی نوک سے دروازے کی چٹائی نوچ پھینکتے تھے اور گھروں میں گھس آتے تھے۔ وہ ہمارے ٹوٹے پھوٹے برتن اٹھا لے گئے ہیں۔ وہ ہماری چٹائیاں اور پھٹی پرانی چادریں الٹ پلٹ کر دیتے تھے۔ زمین تک کھود ڈالتے تھے وہ، اس بہانے کہ کہیں ہم نے کوئی چیز ان سے چھپا کر زمین میں دفن تو نہیں کردی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ ہماری بیویوں کو، بہنوں کو، گھسیٹتے ہوئے لے جاتے تھے اور تمھاری خدمت میں پیش کرتے تھے۔کیا وہ ہمارے ذاتی گھر، ہماری ذاتی جھونپڑیاں نہ تھیں؟ کیا ہم ... انسان نہ تھے۔ ہاں ہاں! میں کان کن، یہ غلیظ مزدور... ہم سوچ نہیں سکتے۔سوچنے کی صلاحیت نہیں ہے ہم میں۔''

''تم! تم'' روزمہر کی زبان لڑکھڑائی۔ ''تم لوگ صدیوں سے اس کے عادی تھے... تم کو یہ بُرا نہیں لگ سکتا تھا اور کیوں میری زبان کھلواتے ہو... کتنے ہی تو خوش ہوتے تھے کہ ان کی عورتیں ہمارے حرم میں آئیں گی، ہم سے ہم بستر ہوں گی۔ ان کے ذریعے وہ ہم سے... ہم سے اپنے چھوٹے موٹے کام کرواتے تھے۔لگان میں چھوٹ... قرض کی ادائیگی میں تاخیر کی اجازت...''

روزمہر کی بات میں جو نصف سچائی تھی وہ برزین کے مُنھ پر طمانچے کی طرح پڑی۔لیکن یہ مکمل سچ نہ تھا۔ وہ ذلیل وخوار رہتے تھے اور اگر ان میں کوئی ذلت وخواری میں خوش رہنے لگا تھا تو وہ کیچوا بن گیا تھا جو غلاظت میں لوٹ کر خوش رہتا ہے۔ ان منصب داروں اور وزرگان نے انھیں کیچوے بنا دیا تھا جو اہرمن نے پیدا کیے تھے۔اس نے زہرآلود لہجے میں کہا:

''اب تمھاری بیٹیاں بھی ہم سے تمھارے چھوٹے موٹے کام کروا لیں گی۔'' پھر اس نے بڑھئی سے کہا: ''لے جاؤ اس لڑکی کو۔ یہ تمھاری ہوئی۔''

''میں اکیلا نہیں رکھوں گا۔'' بڑھئی نے خوش ہوکر کہا۔ ''اس کو ہم سب بانٹیں گے۔ یہ بھی مشترکہ ہوگی۔ کیوں دوستو؟''

مملکتِ ساسان میں، صدیوں سے اپنی زوجاؤں کو مشترک بناتے، دوستوں کو عاریتاً دیتے، رضامندی سے یا زبردستی اپنی عورتوں کو امراء کی زنِ چگاریاں بناتے انسانوں کے غول کے لیے یہ

کوئی انوکھی، دنیا سے نرالی بات نہ تھی۔ انھوں نے اسے توجہ سے بھی نہ سنا۔ وہ سب اب فرش پر بیٹھ چکے تھے اور روزمہر کی قیمتی شراب کے جام لُنڈھا رہے تھے۔

مگر روزمہر نے ایک ایک لفظ غور سے سنا تھا۔ وہ تعجب بھرے غیظ وغضب سے سوچ رہا تھا۔

''عورتوں کو؟ اب یہ عورتوں کو بھی مشترکہ ملکیت بنائیں گے۔ کچھ پتہ نہ ہوگا کہ کس بچّے کا باپ کون ہے۔ آہ تو کیا عظیم سلطنتِ آریانان سے نسب کی شناخت اُٹھ جائے گی؟'' ...

''اس کی نظر میں یہ قانون خدائے پاک کی بدترین توہین تھی۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ نسب معاشرے میں بری طرح خلط ملط صدیوں سے ہوتی آئی تھی، لیکن ان ہی معاشروں کے ایک زرکار حاشیے میں وہ محفوظ بھی تھے۔ سب باخبر تھے اور تسلیم کر سکتے تھے کہ منصب دار کے بیٹے منصب دار، موبدان کے بیٹے موبدان، وزرگان کے بیٹے وزرگان بنیں گے۔ باپ کا نسب آگے بڑھائیں گے۔ یہ بدمعاش کمینگی اور غلاظت کو شرافت اور نجابت سے خلط ملط کرنے کے درپے ہیں۔ یہ مملکت ایک جہنم بن جائے گی۔ کیا غلط سوچا تھا میرے چچیرے بھائی زرمہر نے کہ اس نیم پاگل بادشاہ کو قتل کر دیا جائے جس نے مزدک کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا ہے!! آہ! کاش وہ کامیاب ہو گیا ہوتا... مگر شاپور مہران... بدانجام شاپور مہران نے اسے قتل کروا دیا... لیکن اس کو ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ہم ابھی ہیں، اسی روئے زمین پر موجود ہیں ہم!''

''اٹھو، اٹھو!'' برزین نے مردہ دلی سے کہا۔ ''اب چلو... تم پینے میں لگ گئے... یہ مختلف وقت ہے، بالکل مختلف... اُلٹنا پلٹنا سب چیزوں کو یہ... یہ کوئی محفلِ مے نوشی نہیں ہے۔''

وہ باہر جانے لگا، جاتے جاتے اس نے مڑ کر پست آواز میں کہا:

''اس لڑکی کو چھوڑ دو!''

بڑھئی کا مُنھ بن گیا۔ برزین باہر چلا گیا۔

لیکن اس ماہ حویلیوں اور محلوں سے لڑکیاں اٹھائی گئیں۔

۱۴

طیسیفون کے ایک کشادہ راستے پر اس روز پہلی بار خون بہا۔

یہ راستہ جو طیسیفون سے نکل کر صوبۂ فارس کے شہر اصطخر تک جاتا تھا، جہاں اس سے پہلے اس کے کنارے بنی شاندار حویلیوں اور جاگیروں سے صرف سجے سجائے دو اور چار گھوڑوں والے رتھ یا جاگیری مسلح دستوں کے تازہ دم سوار ہی گزر سکتے تھے اور جن کی یکساں رعب دار ٹاپوں سے فضا گونجتی تھی، آج طیسیفون کے مزدوروں، کان کنوں اور کسانوں سے بھرا پڑا تھا۔ کوئی جاگیردار اپنے خاندان اور ذاتی فوجی دستے سمیت طیسیفون چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مزدوروں کے ہاتھوں میں بلّم، بھالے تھے، پھاوڑے اور کلہاڑیاں تھیں، کسی نے ہتھوڑا اٹھا رکھا تھا۔ وہ حویلی کے گودام توڑ رہے تھے اور مال واسباب لوٹ رہے تھے۔ شاہراہ پر ایسا ہنگامہ برپا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

مزدوروں کی بھیڑ میں عورتیں بھی شامل تھیں، گو ان کے بڑے جتھے ہجوم کی پشت پر تھے مگر وہ پوری طاقت سے اپنے مردوں کو آگے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

کررر کی آواز کے ساتھ رتھ کا پہیہ باہر آ گیا۔ رتھ ایک سمت لڑھک کر ٹیڑھی ہو گئی۔ سواریاں چیخیں مارتی ہوئی نشستوں سے لپٹنے کی کوشش کرنے لگیں۔

چند مزدوروں نے رتھ میں سوار نازک اندام کنیزوں کو گھسیٹ کر نیچے اتارنے کی کوشش کی مگر جاگیری دستے کی چمکتی ہوئی تلواروں نے ان کے ہاتھ روک دیے۔ ہجوم میں سے کئی کے بازوؤں پر، سینے اور چہروں پر گہرے زخم آئے تھے۔ ہجوم پہیے کو دوبارہ رتھ کی چوبی میخ سے جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر پہیہ واپس گھس گیا۔ رتھ نے جنبش کی۔

برزین ایک ڈھلان کی سنگی سیڑھیوں پر حیران و پریشان کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا جو اس درجے متحرک تھا کہ وہ کوئی چہرہ پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اس کے ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کی آنکھوں میں گر رہے تھے جن کو وہ بار بار اپنی بوسیدہ قمیص کے دامن سے صاف کر رہا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی۔

''رک جاؤ، رُک جاؤ!''

لیکن اس کا گلا سوکھا ہوا تھا۔ شاہراہ پر اتنی دھکم پیل تھی کہ اس کے عین سامنے تیزی سے

گزرنے والے بھی اس کی کمزور آواز نہیں سن سکتے تھے۔

اس بھیڑ میں چند کاتب بھی آ ملے تھے جو خاندان کی فاقہ کشی سے مجبور ہو کر لوٹنے والوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے بڑے بڑے برتن تھے جن میں وہ غلہ بھر سکتے تھے۔ تومند مزدوروں کا ریلا انھیں بار بار پیچھے دھکیل رہا تھا۔ ایک ہانپتا ہوا کاتب برزین کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ غلے کا برتن اس نے اب بھی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

''رک جاؤ۔'' برزین نے پھر چیخنے کی کوشش کی۔ کاتب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر اس نے کہا:

''قمیص۔ قمیص لہراؤ۔''

برزین نے فوراً قمیص اتاری اور اسے پوری طاقت سے لہرانے لگا۔ ایک آدھ مزدور کی نظر اس پر پڑی۔ ایک کان کن نے اسے پہچان لیا۔ وہ دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔

''کہاں ہے؟ تمھارا برتن کہاں ہے؟''

برزین نے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر کر اس کا بازو جکڑ لیا۔

''مہر شاہ! مہر شاہ! یوں نہیں! یوں تو نہیں۔''

''یوں نہیں؟'' مہر شاہ نے کچھ غصے سے کہا۔ ''پیغمبرِ محترم نے ہمیں اجازت دی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو؟ یہاں ہمارے لوگ جان سے مار ڈالے گئے ہیں۔''

پھر وہ رک کر بولا:

''اور یہ جاگیردار، اور ان کا خاندان۔ ہم ان کی جان نہ لیتے۔ دو دن پہلے جو امراء کا خاندان جاگیری مسلح دستے کے ساتھ کسانوں اور کاریگروں کو قتل کرتا ہوا نکلا تھا، اصطخر کے راستے پر، انھوں نے تین کان کنوں اور ایک لوہار کو قتل کر ڈالا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جا کر ان کے ہی مسلح دستے نے ان امراء کا بچہ بچہ مار ڈالا تھا اور اسباب سے بھرے چھکڑے، سارا سونا چاندی ہتھیا کر بھاگ گئے تھے۔ امراء کے خاندان کی لاشیں اب بھی اصطخر کے بڑے راستے پر پڑی ہیں۔ ان کو گیدڑ اور لکڑ بگھے کھا رہے ہیں۔''

''عورتوں کو بھی مار ڈالا!'' برزین نے صدمے سے کہا۔ دین میں عورت پر ہتھیار اٹھانا گناہِ کبیرہ تھا۔

''عورتوں کو؟'' مہر شاہ نے پھیکی ہنسی سے کہا۔ ''نہیں۔ ان کو تو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بانٹ لیں آپس میں۔''

''مہر شاہ'' برزین نے بے بسی سے کہا۔ ''ہمیں پیغمبرِ محترم کے پاس جانا پڑے گا۔ آج، اسی وقت۔ آج رات۔ ہم سو کے قریب کان کنوں کو جمع کرتے ہیں۔ یہ بات ایک گھر سے دوسرے گھر پہنچانی ہے۔ نہیں۔ صرف کان کن نہیں۔'' اس نے تیزی سے سوچتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''کچھ کسانوں کو بھی ساتھ لے لینا۔ کاریگروں کو بھی۔'' پھر اچانک کسی خیال نے اسے چونکا دیا۔ وہ نچلی سنگی سیڑھی پر بیٹھے کاتب کی طرف جھپٹا۔

''ہمیں لکھنا نہیں آتا۔'' برزین نے کہا۔ ''تمھارا نام کیا ہے۔''

''نرسی۔ مجھے کچھ بھی نہیں ملا۔ یہ دیکھو۔'' کاتب نے اسے خالی برتن دکھایا۔

''میں ابھی اسے بھرواتا ہوں۔'' برزین نے کہا۔ ''تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔''

مہر شاہ اس کا برتن گھسیٹتا ہوا حویلی کے گودام کی طرف بھاگا۔

کاتب کچھ خوف اور پریشانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب بھیڑ کو چیرتا دھکے دیتا مہر شاہ اس کا برتن گھسیٹتا ہوا واپس آ گیا جو گیہوں اور باجرے کے دانوں سے بھرا ہوا تھا تو کاتب کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کھڑا ہو گیا اور جھک جھک کر ان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

''مہر ارباب شکر گزار۔ یہ زمین و آسمان ہر دم آپ کی مدح کریں۔ اے برتر بندگان خدا...''

برزین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم ہمارے ساتھ چلو گے۔''

اس نے سختی سے کہا:

''اے آقائے ثمر و اشجار و ستارگان!'' کاتب نے لجاجت سے کہا۔ ''مجھے گھر جانا ہے۔ علاوہ ازیں میری زنِ پادشائی کی طبیعت...''

''یہ کلہاڑی دیکھی ہے؟'' مہر شاہ نے اس کے سامنے کلہاڑی لہرائی۔ ''یہ پتھر توڑ ڈالتی ہے۔ تمھاری یہ پتلی سی گردن کیا چیز ہے۔ میں کان کن ہوں۔''

دور سے ساسانی فوجی دستے کے سواروں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں جو کوڑے پھٹکارتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔

حویلی کے سامنے سے ہجوم تتر بتر ہونے لگا۔

کاتب نے آنکھیں گول کیں اور آسمان کی طرف دیکھا۔

پھر اس نے کہا: ''چلوں گا۔'' وہ اناج سے بھرے بھاری برتن کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں اٹھاتا ہوں۔'' مہر شاہ نے کہا۔ ''تمھارا گھر بھی دیکھ لوں گا۔'' وہ دونوں چلے گئے۔

برزین دور تک انھیں دیکھتا رہا۔ پھر چونک کر فوجی دستے کی طرف دیکھا، جس کے کمان دار کی شلوار

پر چاندی کی پٹی چمک رہی تھی اور خود پر ایک کلغی سجی تھی۔ برزین کی مزدک پیغامبر سے قربت کے باعث فوج کے افسران اسے پہچاننے لگے تھے اور اس پر بھروسا کرتے تھے۔ اس نے برزین کو گردن کے اشارے سے بلایا۔

''یہاں کیا ہوا تھا؟''

''یہ خاندان اصطخر جا رہا تھا۔'' برزین نے بتایا۔

''ہوں!'' کماندار نے کہا۔ ''کسی کی جان تو نہ لی؟''

''نہیں۔ کچھ لوگ زخمی ہو گئے ہیں۔''

کمان دار گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھنے لگا۔ جاتے جاتے اس نے کہا:

''کیوں جا رہے ہیں فارس۔ کسان تو وہاں بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ وہاں قحط نہیں۔ پورے فارس سے بارشوں کی خبر ہے۔ کان کن! مرحوم شاہ بالاش کے کئی قبیلے تو سیستان میں بھی ہمارے ساتھ ہو گئے ہیں۔''

برزین اس کی بات غور سے سنتا رہا۔ پھر گھر کی طرف چل دیا۔ ایسا اس نے بھی سنا تھا، گو ان ہنگامہ خیز دنوں میں اسے زیادہ باتوں کی فرصت نہ تھی۔ مگر سننے میں یہی آ رہا تھا کہ صوبہ فارس اور ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلے مکران اور سیستان میں مزدک کا پیغام پہنچ رہا تھا۔ کسان اور محنت کش طبقات اس کے ساتھی بن رہے تھے۔ اور صرف وہی نہیں، آتش کدوں کے بڑے موبدوں اور امراء کی گٹھ جوڑ سے ہلاک یا معذور کر دیے جانے والے بادشاہوں کے تمام قبیلے موبدوں اور وزرگان کے ہاتھوں سے بادشاہ گری چھین لیے جانے پر مسرور ہو کر ان سے آ ملے تھے۔ عظیم الشان سلطنت ساسانیہ کے گاؤں گاؤں، شہر شہر پھیلے ہوئے آتش کدوں کو زیادہ تر بند کیا جا رہا تھا۔ خود طیسیفون میں سینکڑوں آتش کدوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ اب صرف تین بڑے معبد باقی تھے، جن میں سے ایک میں خود پیغامبر مزدک جایا کرتے تھے۔

''عبادت گاہوں کی بہتات دین کو ناپاک کر دیتی ہے۔''

ایسا ان کا کہنا تھا۔ برزین مسرت سے مسکرایا۔

اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سامنے اس کا گھر تھا۔ گھر کے سامنے اس کے بچے کھیل رہے تھے وہ برزین کی طرف دوڑے۔

''کیا لائے۔ ہمارے لیے کیا لائے۔''

''کچھ بھی نہیں۔ پدر روز کچھ نہیں لاتا۔ تم نے کھانا تو کھایا نا۔'' برزین نے بچوں کے

گھنگھریالے سیاہ بالوں کو سہلایا اور چھوٹی بچّی کو گود میں اٹھائے گھر میں داخل ہوا۔
اندر اس کی بیوی چکی پیس رہی تھی۔ سیاہ بالوں کی ایک لٹ اس کے گورے رخسار پر جھول رہی تھی۔

''مہرین۔'' برزین نے کہا۔ اب بھی اس کی بیوی کتنی خوبصورت تھی۔ کسا کسایا بدن۔ چمکتی سیاہ آنکھیں اور گلابی ہونٹ۔ جب وہ کھانا پکاتی ہوتی تو آگ کی تمازت سے اس کا پورا چہرہ گلابی ہو جاتا۔

مہرین نے اسے نظر اٹھا کر دیکھا پھر اس کے آس پاس دیکھا۔''میں کھانا تیار کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ برزین اپنے ساتھ کوئی گٹھری نہیں لایا جسے اس کو فوراً کہیں سنبھال کر رکھنا پڑے۔

بچّی کو زمین پر چھوڑ کر برزین ننگی چار پائی پر بیٹھ گیا جس کا بستر تہہ کر دیا گیا تھا۔ طاق پر دھرے گلاس کے پانی میں گلاب کا ایک پھول لگا تھا۔

برزین ہنسا۔''میں کچھ نہیں لایا۔''

''اچھا کیا۔'' مہرین نے جواب دیا۔''ابھی گھر میں اناج ہے۔''

پھر اس نے ابرو اٹھا کر بناوٹی ناز سے کہا:

''میں تو ڈرتی رہتی ہوں۔ کسی دن تم ہر بزوں کی کسی حسینہ کو نہ اٹھا لاؤ۔''

برزین زور سے ہنسا۔''میں جانتا ہوں تم اسے زہر دے دو گی۔''

مہرین نے آٹا سمیٹا اور ایک پرات میں آٹا ڈال کر پانی ملایا۔

آٹا گوندھتے ہوئے وہ شوخی سے ہنسی۔

''خیر ایسا تو نہیں، مگر۔''

مہرین، جو امراء کے گھر لے جائی جاتی رہی تھی۔ لیکن وہ تو ان دنوں میں بھی چھپ چھپ کر برزین سے ہی ملتی تھی۔ برزین کے دل کی گہرائیوں میں دو آنسو بننے لگے۔ لیکن وہ ان کو پی گیا۔

''ارے جان! تمھارے سوا کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کبھی۔''

مہرین اب تندور سلگا رہی تھی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا کہ تندور گرم ہو جائے۔

برزین جوتے اتارنے لگا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ جھوٹ تھا لیکن بیوی سے جھوٹ تو بولنا ہی پڑتا ہے۔ پکڑی گئی امراء کے خاندان کی لڑکیوں کے ساتھ اس نے شروع شروع میں چند مرتبہ قربت کی تھی۔ وہ انھیں گھر کبھی نہیں لایا تھا۔ جنگل میں درختوں کے کسی جھنڈ میں کسی ویران حویلی میں

ستونوں کے عقب میں۔ لیکن ہر بار وہ ایک احساسِ زیاں کے ساتھ واپس آیا تھا۔ وہ حسینائیں، اس کے لیے گوشت کے ایک پتلے کے علاوہ کیا تھیں؟ اس کی مردانگی تک تو جلد ختم ہونے لگتی تھی، جس نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ ان نازک اندام حسیناؤں سے واقف نہ تھا جو ہم بستری کے درمیان روتی دھوتی رہتی تھیں۔ وہ انھیں تسلی دینے میں لگ جاتا۔ ''میں تم کو کسی مہربان فطرت مزدور یا کسان کو دے دوں گا۔'' اسے مہرین یاد آنے لگتی۔ مہرین! جس کو اِس کی ماں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہرین اس کی طرح کرد نہ تھی۔ اس کے باپ دادا کبھی فارس سے طیسیفون آئے تھے۔ وہ مزدور تھے اور سلطنت کے پایۂ تخت میں اتنی عالی شان عمارتیں بنتی رہی تھیں کہ اس میں سلطنت بھر کے مزدوروں کے لیے روزگار تھا۔ یہیں برزین کو وہ ایک کنویں پر پانی بھرتی نظر آئی تھی اور اس کو بے خاندان کا جان کر مہرین کے ماں باپ نے برزین سے بخوشی اس کی شادی کر دی تھی۔

وہ اپنی اکلوتی بیوی سے خوش تھا... بہت خوش... مہرین نے اس چھوٹے سے مٹی کے گھروندے میں، جو برزین نے اپنے ہاتھوں سے بھوسا اور مٹی ملا کر بنایا تھا، ایک خوبصورت مدھم روشنی سی پیدا کر دی تھی۔

مہرین نے اس کے سامنے سبزی کا آش اور نان رکھا۔

''تم بھی کھاؤ۔'' برزین نے پہلا نوالہ اس کے مُنھ میں دیا۔

''ہوں۔'' مہرین نے ہنستے ہوئے بھرے مُنھ سے کہا۔

''پھر نان کون بنائے گا۔'' وہ تندور کی طرف واپس مڑ گئی۔

برزین جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔ ''مجھے جانا ہے۔''

اس نے کہا۔ بہت ضروری کام سے۔ لوگوں کو اطلاع دینی ہے۔ رات کو۔ آج رات۔ ہم محترم پیغمبر سے ملیں گے۔ پہلے تو ان کو بتانا ہے۔

کھانا کھا کر ایک برتن میں پانی بھر کر برزین اپنے مٹی کے گھر سے باہر آیا۔ اس نے کلی کی، ہاتھ مُنھ دھویا۔ پھر اس نے پیر دھوئے۔ ''اے میرے پیرو!'' اس نے کہا۔ ''آج تم کو بہت کام کرنا ہے۔'' انگلیوں کو پانی میں بھگو کر اس نے کہنیوں تک پھرا کر مسح بھی کر لیا۔ یہ ایک مقدس عمل تھا جو آگ کی پرستش سے پہلے کیا جاتا تھا۔ وہ ایک مقدس کام کرنے جا رہا ہے۔ ایسا اس کو یقین تھا۔

۱۵

اس رات پیغمبر مزدک کی حویلی کا احاطہ مزدوروں، کان کنوں اور کاریگروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ زمین پر، ستونوں کے نیچے، سوکھی گھاس پر، تالاب کی منڈیروں پر بیٹھے تھے۔ وہ تعداد میں سو سے کہیں زیادہ تھے۔ جو بھی سنتا کہ پیغمبر مزدک ان کو اس عظیم تبدیلی کو صحیح طرح کرنے کے احکامات دینے والے ہیں وہ اس گروہ میں فوراً شامل ہو رہا تھا۔ ہزاروں مزدور، کاریگر اور کسان لوٹ مار سے بیزار تھے۔ لوٹ مار ان کا آبائی پیشہ نہ تھا، یہ تو ان ٹولوں کا کام تھا جو بیستون کے سیاہ پہاڑوں میں چھپ کر رہتے تھے اور مملکت کی عظیم الشان شاہراہوں پر سفر کرتے تجارتی قافلوں کو لوٹ لیتے تھے۔ مگر وہ مجبور تھے، پیٹ کی آگ سے مجبور، وہ اس بات سے متفکّر بھی تھے کہ ان میں ہی سے چند ایک کو اب اس لوٹ مار میں لطف آنے لگا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اناج اور اسباب صرف جسمانی قوت رکھنے والوں کو ہی مل سکتا تھا۔ کیا کوئی دوسرا راستہ ہے؟ وہ جاننا چاہتے تھے۔

حویلی کے منقش برآمدے میں ایک محراب کے نیچے بھی قالین گول کمرے سے کھینچ کر باہر لائے اور بچھا دیے گئے تھے۔ وسطی قالین پر مزدک چہار زانو بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں جانب کاتب کئی دواتوں اور لمبے لمبے کاغذوں کے پشتے سنبھالے بیٹھا تھا اور دائیں جانب، لوگ دیکھ کر حیران تھے، مزدک کا یہودی دوست جوشوا بیٹھا تھا جو مزدک سے سر جوڑے کسی طویل سرگوشی میں مصروف تھا۔ ''وہ حساب داں اسی دن کے لیے تو بنا تھا۔'' مجمعے میں کسی نے سرگوشی کی۔ ''اس کے باپ نے اسے کیسے آنے دیا؟''

''وہ تو موبدوں کا حساب کرتا ہے اور سود در سود سے ہماری کھال ادھیڑ لیتا ہے۔'' دوسرے نے سرگوشی کی۔

''دیکھو یہاں کئی بڑے باپوں کے بیٹے بیٹھے ہیں۔'' برزین نے خوشی سے سرگوشی کی۔ اسی بھیڑ میں ستون کے زیریں حصے سے چمٹا شہزادہ کاوس بھی بیٹھا تھا، جس نے مزدوروں اور کاریگروں کے اصرار کے باوجود قالین پر بیٹھنا گوارا نہ کیا تھا۔ وہ مشکل سے سترہ سال کا ہو گا۔ وہ مزدک کا پرجوش پیرو کار تھا اور برابری کے نشے میں سرشار، برابری جس کا اسے زندگی کے سترہ برسوں میں کوئی تجربہ نہ ہوا تھا اور جو اُس کے لیے ایک اچھوتا شراب سے بڑھ کر سرور لانے والا مشروب... ''اس

بیکار زندگی کو معنی مل گئے جیسے!'' وہ خاموشی سے بار بار دُہراتا۔ ''قید سے رہائی ملی گویا!! محل میں قید، شاہی رتھ میں قید، سیر چمن میں قید، ہر لمحہ، ہر گھڑی چوبدار پہرے دار، کنیزیں۔ جن کے جسم اتنے یکساں کہ وہ ان کے چہروں تک کو نہ پہچان پاتا تھا۔ کیا تم کل رات نہیں آئی تھیں؟ اچھا، وہ کوئی اور تھی؟ وہ بددلی سے کہتا۔ ہاں ان میں کچھ جسم سفید اور کچھ سانولے تھے۔ مگر ان پر چہرے کون سے لگے تھے۔'' پندرھویں برس سے کاوس کو شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ کسی نوے سالہ ضعیف کی مانند نسیان میں مبتلا ہونے لگا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ صرف بیزار تھا۔ اس کا کم سن دماغ۔ بچپن اور نوجوانی کے دوراہے پر۔ اب تو پانچوں حسیں کام کر رہی تھیں۔ وہ ساتھیوں کے چہرے اور آوازیں تک دور سے پہچانتا تھا۔ اسے سب کے نام یاد تھے۔ سب کے گھروں کے راستے۔ کون کیا کام کرتا ہے۔

اچانک مزدک کی آواز بلند ہوئی۔ ایک صاف، گونجیلی، ایک بڑے موبد کی تربیت یافتہ آواز۔ مجمعے کی بھنبھناہٹ فوراً غائب ہوگئی۔

''کسانو، کاریگرو، کان کنو! لوٹ مار فوراً بند کر دو۔ اس طرح صرف طاقت وروں کو اسباب اور اناج ملے گا۔ شہنشاہ قباد کی فوج سرکاری گوداموں میں غلہ جمع کر رہی ہے یہ ہر مہینے حسبِ ضرورت تمھارے گھروں تک پہنچ جائے گا۔ کفایت سے خرچ کرو۔''

پیغمبر نے کہا:

''وزرگان اور امراء کو نہ ستاؤ۔ ہم نہیں چاہتے وہ گھر سے بے گھر ہوں۔ ہم نے ان کے لیے، اور سب کے لیے۔ قانون بنائے ہیں۔ یہ تم کو جوشوا بتائے گا۔''

جوشوا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''اے لوگو!'' اس نے کہا... اور کاغذ کی چندیوں سے پڑھنا شروع کیا۔

''سب سے پہلے تو تمام کسانوں، دست کاروں، مزدوروں، کان کنوں کا شخصی لگان معاف کیا جاتا ہے جو پیشہ ور غلاموں کو بھی وزرگان، موبدوں اور امراء کو دینا پڑتا تھا۔''

مجمعے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''آئین کے مطابق عید نوروز اور مہرگان کے جبری تحفے جو موبدان وصول کرتے رہتے تھے، آج منسوخ کیے جا رہے ہیں۔''

مجمع دم بخود۔

دولتِ ساسانیہ کی تمام زرعی زمینیں، جو امراء کی ملکیت تھیں، بحکمِ شہنشاہ آج تمام لوگوں میں برابر برابر تقسیم کی جاتی ہیں۔

''زندہ باد! زندہ باد۔'' لوگ خوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نعرے لگانے لگے۔ جوشوا گھبرا گیا۔ وہ یہودی تھا اور اس نے زندگی میں اپنی قوم کو اتنا خوش نہ دیکھا تھا جن کو ہمہ وقت کسی بادشاہ، وزیر، امیر یا زرتشتی موبد کی ناراضگی کا خوف رہتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ خوفزدہ ہو گیا کہ یہ جشن مناتا ہجوم اس پر حملہ تو نہیں کر دے گا۔

آتے ہوئے اس کے باپ نے کہا تھا:

''کہاں جا رہا ہے نالائق! یہودی کا یہودی کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ آریان۔ میں اور تو ان کے رحم و کرم پر ہیں۔''

کیا وہ سچ کہہ رہا تھا!

جوشوا کا دل کانپ رہا تھا۔

لیکن اس کی پتلیاں پھیل گئیں اور حلق خشک ہو گیا جب اس کے سامنے بیٹھے آریان مزدور اور کسان، کاریگر اور کان کن دونوں باز و لہراتے خوشی سے مست کھڑے ہوئے۔

''زندہ باد! زندہ باد! جوشوا حساب دان!''

ان کے نعرے کسی زمزمے کی طرح لہراتے ہوئے ہر طرف پھیل رہے تھے...

جوشوا کا دماغ بالکل منتشر تھا... یہ سب کیا ہو رہا تھا! ایسا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا... وہ خوشی سے رونا بھی بھول گیا۔

مزدک کی حویلی سے باہر سیاوش گہرے بادامی گھوڑے پر سوار اپنی ہزار سپاہ کا ایک چھوٹا سا دستہ لیے مودب کھڑا تھا۔ وہ آج سپہ سالارِ اعظم کی حضوری میں تھا مگر اس کے کان اور چوکنا ذہن اندر کی آوازوں پر لگے تھے۔ سپہ سالار خود اس حویلی کے باہر آج کیے جانے والے فیصلوں کے منتظر تھے۔

''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔'' مزدک کی آواز گونجی۔

مجمع تھوڑی دیر کے بعد ہی بیٹھ سکا۔

''آج سے طیسیفون کے تمام آتش کدے بند کیے جاتے ہیں۔ آپ میں سے جس کے پاس گھر نہیں وہ وہاں رہ سکتے ہیں۔ شہر میں تین بڑے آتش کدے کافی ہیں۔ ان کے موبدان پر لازم ہے کہ وہ کاشت کاری کریں یا کوئی دوسرا ہنر سیکھ لیں۔''

مجمعے نے یہ بات خاموشی سے سنی۔ اب تک جوشوا ایک پیالہ پانی پی چکا تھا۔ اس کے اوسان بجا ہو گئے تھے۔ اس نے کاتب کی طرف دیکھا اور کہا:

''لکھو! یہ پیغمبر کا فرمان ہے اس کی ایک نقل پیغمبرِ محترم کے پاس رہے گی۔ اور ایک ایک نقل

طیسیفون کے تمام ضلعوں کے منصفوں کو بھیج دی جائے۔''

کاتب نے نیا صفحہ اپنے سامنے نیچی تپائی پر پھیلایا اور قلم سنبھالا۔ یہ ہلکی پھلکی دراز دار تپائی وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ جوشوا نے کاغذ کی چندیوں سے پڑھنا شروع کیا:

''سالانہ شخصی لگان اب مزدوروں، معماروں، دستکاروں اور کان کنوں کی جگہ امراء اور جاگیرداران پر لگایا جائے گا۔ اب تک یہ کسی نہ کسی بہانے سے لگان دینے سے انکار کرتے رہے ہیں اور ان کا کہنا رہا ہے کہ اناج اور پھل تو نہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ ان پر لگان کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن پیغمبرِ اعظم اور شہنشاہِ مملکت، فرمانروائے دولت ساسانیہ کے حکم سے ہم ان پر لگان عائد کر رہے ہیں۔ آپ سب اپنی آمدنی پوری اپنے پاس رکھیں۔ آپ پر لگان نہیں۔ کرشان سبزی، ترکاری، پھلوں اور اناجوں کا چھٹا حصہ خود رکھیں۔ جاگیروں کے لگان یہ ہیں:

- گیہوں اور جو پر سالانہ ایک درہم۔
- انگور پر آٹھ درہم۔
- چاول پر ۵/۶ درہم۔
- چارے پر سات درہم۔
- چار ایرانی کھجوروں کے درختوں پر۔
- چھ آرامی کھجور کے درختوں پر۔
- چھ زیتون کے درختوں پر۔''

جوشوا کی آواز ڈوب رہی تھی اور ابھر رہی تھی۔ کاتب کا قلم روشنائی میں غوطے لگا رہا تھا۔ کاغذ پر قلم کی سرسراہٹ مسلسل کسی پرندے کے پر کی مدھم سی پھڑپھڑاہٹ کی طرح جاری تھی۔

تب ہی بھیڑ کو چیرتا سپہ سالارِ اعظم داخل ہوا۔

''ایک لمحہ توقف فرمایئے۔'' اس نے پیغمبر کی طرف جھک کر کورنش بجاتے ہوئے کہا۔

کاتب کا قلم رک گیا۔

''جنگی اخراجات کی مد میں کیا رکھا گیا ہے؟'' سپہ سالار نے بہ مشکل آواز اور لہجے کو مودب بنا کر پوچھا۔ جس کی اسے عادت نہ تھی۔ لیکن اس نے تصوّر کر لیا کہ وہ بہ نفسِ نفیس شہنشاہ سے مخاطب ہے۔

''جنگ کے لیے؟'' پیغمبر نے دبی دبی جھنجلاہٹ سے پوچھا۔

''نہیں! اب یہ کرشان اور مزدور ایک درہم بھی نہ دیں گے۔ ختم ہوا وہ زمانہ جب جنگی اخراجات کے لیے ان کے ٹوٹے پھوٹے برتن بیچے جاتے تھے۔''

سپہ سالار لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا:
"نہیں... میرا یہ مطلب نہ تھا۔ یہ کرشان وغیرہ تو لشکر کے سامنے اور پیچھے چلا ہی کرتے ہیں۔ جنگ میں ان کی جسمانی خدمات کافی ہیں۔ لیکن وزرگان اور امراء حالتِ جنگ میں اپنی تمام دولت شاہی خزانے میں جمع کرادیں گے؟"
"یہ بھی لکھ لو۔" جوشوانے کاتب سے کہا۔ کاتب نے بنا سنوار کر کاغذ پر لکھ دیا۔
"منظور۔" پیغمبر نے سر ہلایا۔
"شکریہ پیغمبرِ اعظم..." شاپور مہران نے اطمینان کا سانس لیا۔
جب وہ واپس جانے کو مڑا تو مجمعے نے کائی کی طرح پھٹ کر اس کے لیے راستہ بنا دیا۔
مہران اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کا دل اب مطمئن تھا۔ اس نے نیام سے شمشیر کھینچ کر بلند کی۔
"دولتِ ساسانیہ۔ زندہ و پائندہ باد!"
اس نے بلند آواز میں کہا۔
دستے کے ہر سپاہی نے تلواریں بلند کر کے اس کا نعرہ دُہرایا۔ دُلکی چال سے دستہ طیسیفون کی گلیوں کی طرف چل پڑا۔
سیاوش مطمئن اور خوش تھا۔ اس دستے کا ہر سوار مطمئن تھا۔ ان کی عزت تھی، وقار تھا، ان کو وقت پر اچھی تنخواہیں ملتی تھیں۔ وہ دولتِ ساسانیہ کے فوجی تھے۔ ان سے روما کے شہنشاہ تک مرعوب رہتے تھے۔ اب سپہ سالارِ اعظم مہران ان کی خوشی کی ضمانت لے کر آئے تھے۔ جنگ تو یقینی تھی۔ آج نہیں تو کل۔
کیا قومِ ہونان سے؟ نہیں۔ وہ تو شہنشاہِ معظم کے دوست تھے۔ ایک عرصہ گزارا تھا قباد نے قومِ ہونان کے ساتھ۔ ان کے خاقان نے قباد کے باپ شہنشاہِ پیروز سے جنگ کی تھی۔ شہنشاہ ان کی اچانک وحشیانہ یلغار کی تاب نہ لا سکا تھا۔ اس وقت ساسانی فوجیں گھر گئی تھیں۔ موبدوں اور بدبخت زرمہر کی غداری نے بے بس کر دیا تھا شہنشاہ کو۔ ہونان، خاقان نے خراج طلب کیا تھا جو پیروز نہ دے سکا تھا۔ تب وہ ننھے قباد کو یرغمال بنا لے گئے تھے۔ وہ کئی برس خاقان کے محل میں رہا تھا۔ سال چھ مہینے میں خاقان اور اس کی نرم دل ملکہ کو انسیت ہو گئی تھی قباد سے۔ چند برس بعد جب پیروز ان کی مانگی ہوئی رقم مہیا کر سکا تو اسے واپس بھیجتے ہوئے خاقان اشکبار ہو گیا تھا۔
"میں ہمیشہ جانتا تھا۔" خاقان نے کہا تھا۔ "تم کو واپس تو جانا ہی ہے... ایک دن۔"

ملکہ اسے رخصت کرنے باہر نہیں آئی تھی۔ وہ صدمے سے بیمار ہوگئی تھی۔

''ایسا ہوتا ہے بچے کا جادو! عورت کا دل! انسان کا دل!!'' جیسا اس کا دوست مزداد کہتا تھا۔ مزداد جو اب مزدک تھا۔ پیغمبرِ محترم! جس نے عزیز از جان شہنشاہ کو خبردار کر کے ان کی جان بچائی تھی۔ دولتِ ساسان بچالی تھی جس نے۔ سیاوش کے ذہن سے خیالوں کی لہریں گزر رہی تھیں۔ ایک ہی وقت میں اسے اپنے بیوی بچے اور مزداد یاد آنے لگا۔

وہ کیا کر رہا ہوگا۔ گاوش ارواح کی دعا پڑھ رہا ہوگا۔ سیاوش نے سوچا۔

اب پیغمبرِ اعظم گاوش ارواح کی دعائیں پڑھ رہا تھا، مقدس گائے کی روح کو بلا رہا تھا۔

ایک بلوریں کوزے سے گائے کا تازہ پیشاب لکھے ہوئے کاغذ پر بوند بھر ٹپکا دیا گیا۔ اب یہ پاک اور مقدس قوانین تھے۔

مجمعے نے مناجات گائی۔ وہ مزدک کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ مزدک نے انھیں نہ روکا۔

''اے اہورامزدا، اے وہ کہ جس پر سات آسمان اور زمین کا ہر طبق روشن ہے اور انسان کا دل۔''

''تو جانتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سجدہ صرف تیرے ہی لیے ہے۔''

لیکن وہ کبیدہ خاطر ہو گیا تھا۔

جب مجمعے نے سجدۂ شکر سے سر اٹھایا تو مزدک نے کہا: ''آج سے میں تمھارے لیے پیغمبر نہیں، میں تمھارا 'اندوزگر' ہوں۔''

مجمع اسے دیکھتا رہا۔

برزین نے پوچھا:

''کیا؟''

''اندوزگر! یعنی تمھارا استاد، گرو تمھارا۔ تو سب سے پہلا فرق تو یہ ہوتا ہے کہ اندوزگر کو سجدہ نہیں کرتے۔ اس سے اہورامزدا ناراض ہو سکتے ہیں۔''

مزدک نے زور دے کر کہا:

''ہمیں تبدیلی لانی ہے۔ بہت بڑی۔ تو یہ اس طرح تو نہ ہوگی۔ اب، ہم گروہ بنائیں گے۔ ان کا سردار ہوگا۔ ہمیں دور دور تک۔ پوری دولتِ ساسانیہ میں پھیل جانا ہے۔ کون تیار ہے؟''

مجمعے سے کئی جوان لپک کر سامنے آنے لگے۔ ان میں سے کئی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

گھر گرہستی سے آزاد تھے وہ۔

برزین راستہ بناتا ہوا کاتب کی پشت تک پہنچ گیا۔

''یہ پیغام، عظیم ترین پیغمبر کا آخری اور قطعی پیغام۔ پوری دولتِ ساسانیہ میں پھیلا دو۔ انھیں بتاؤ کہ شہنشاہ اور افواج ہمارے ساتھ ہیں۔''

مزدک نے کہا: ''لیکن انھیں کہاں کہاں جانا ہے؟'' اس نے سوچا۔

''پوری دنیا میں پھیلا دو۔'' مزدک نے پہلو بدل کر کہا۔

''نام بتاؤ، نام۔'' برزین جوانوں کے نام پوچھ رہا تھا۔ کاتب ان کو تحریر کرتا جا رہا تھا۔

''پوری دنیا...!'' ایک معمار نے کہا۔ ''لیکن! رومی تو ہمیں قتل کر دیں گے۔''

''تو پھر شروعات دولتِ ساسانیہ سے کرو۔'' جوشوا نے کہا۔ ''یہاں یہودی مزدور اور کام گر تمھارے ساتھ مل جائیں گے۔''

''کتنی بڑی اور کہاں کہاں تھی دولتِ ساسانیہ!''

مزدک نے پریشانی سے سوچا۔ ''کیا پوری دنیا نہیں تھی... میں بھی کتنا نادان ہوں۔ دولتِ روما ہی ساسانیوں کے زیرِ نگیں نہیں تھی۔'' اس پر اچانک یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ وہ دینی علوم میں اس درجہ غرق رہا ہے کہ اسے اور علوم کی یکسر خبر نہ تھی۔ ''دولتِ ساسانیہ؟'' کاتب نے بے اختیار کہا۔ ''کہاں سے شروع کروں؟'' یہ تو کاتب کو ازبر تھا۔ ایک ایک صوبے کا حساب کتاب وہ بھی تو لکھتا رہا تھا۔ پُرامید نظریں اس پر جم گئیں۔

''فاران، کرمان، مکران، کہستان، پارسیا، زابلستان، مرگیانا۔ کوشان آب جیحوں اور سیحوں کے درمیان، طخارستان، سغد، خواز، اب چلو خزد کی طرف۔ البان ہے، گرجستان ہے، آذربائی جان ہے اور آبِ دجیل کے پار۔ نصیبین سے فرات کے مشرقی کنارے تک چلے جائیں۔ سمجھیں سلوکیہ تک۔ وہاں تو...''

کاتب نے گردن گھما کر جوشوا پہ نظر ڈالی۔

''وہاں تو آپ کے دین کے لوگ کثیر تعداد میں ہیں۔ بڑی بڑی عبادت گاہیں۔ اور پھر بابل۔ ادھر عربستان میں حیرہ۔ یہ سب باج گزار ہیں۔ گو زرتشتی نہیں... لیکن یہ شہنشاہ کے پیغامبروں کو کچھ نہ کہیں گے۔'' کاتب نے بات ختم کی۔

''ہم جائیں گے۔'' کاوس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ''ہم اونٹوں پر گھوڑوں پر چھکڑوں میں۔ یا پیدل۔ کسی طرح بھی جائیں گے۔''

''اور۔عورتیں۔'' ایک کسان نے دبی زبان سے کہا۔
''عورتیں؟'' مزدک نے دُہرایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔
''تمھاری شادی ہوئی ہے کرشان؟''
اس نے پوچھا۔
''نہیں پیغمبر۔ میرے آقا۔اندوزگر۔ میرے پاس اتنی رقم کہاں ہے۔'' کرشان نے سر جھکا دیا۔
''اچھا۔'' مزدک نے کہا۔''میں بتاؤں گا۔جلد بتاؤں گا۔'' پھر وہ کھڑا ہو گیا۔
''میں اندر جا رہا ہوں۔اب تم لوگ بھی جاؤ۔''
مجمع آہستہ آہستہ حویلی کے دروازے سے نکلنے لگا۔

۱۶

طیسیفون کے صاف نیلے آسمان پر سفید بادل کا ایک ٹکڑا تیرتا ہوا آیا اور ہوا کے دوش پر سوار آہستہ آہستہ دور نکل گیا۔ دجلہ کے کنارے پر اس کا مختصر سایہ لمحہ بھر نہ رکا، جہاں اَن گنت مزدور اور کسان جمع تھے اور آسمان کی سمت منھ کیے اس ابرِ رواں کو حسرت سے تک رہے تھے۔ تقریباً سوکھے دریا کے کنارے آج ایک بھیڑ جمع تھی۔ ان مزدوروں اور کسانوں کو برزین یہاں لایا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کدالیں تھیں اور وہ جگہ جگہ کنویں کھود رہے تھے۔ مزدک ان میں برزین کو تلاش کر رہا تھا۔

''عالی جاہ پیغمبر!'' مٹی کے ایک تودے نے اسے پکارا۔ برزین؟ ہاں برزین ہی تو تھا وہ۔ مزدک کنویں کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ برزین مٹی سے لت پت تھا۔ اس کا نصف خاک آلود دھڑ کنویں سے باہر نکلا ہوا تھا۔ مٹی سے لپے چہرے میں صرف اس کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھی۔

مزدک نے اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ اس کے شہر کے مزدور نشیب میں بہتے دریا کا پانی بلندی کی طرف کھینچنے کے لیے کنویں کھود رہے تھے۔

''تین ہاتھ!'' کوئی مزدور پکارتا۔ اور دوسرا مزدور تین ہاتھ کی بلندی پر سرنگ کھود کر دونوں کنوؤں کو منسلک کر دیتا۔ دریا کے بالکل کنارے پر کنویں دریا کی سطح سے بھی نیچے تھے۔ جب ان میں پانی بھر جائے گا تو سرنگ کے ذریعے دوسرے کنویں میں پہنچ جائے گا جو ذرا بلندی پر تھا اور اس طرح پانی خود اپنے بہنے کے زور سے شہر کے نواح میں کھیتوں اور باغات کی سطح پر پہنچ جائے گا۔

برزین سینے کو کنویں کے کنارے سے چسپاں کر کے، کان لگا کر سننے لگا۔

''دھک دھک دھک ...'' مٹی سے جیسے دھڑکن کی آواز آ رہی تھی۔ یہ ساتھ کے کنویں میں مزدور کی کدال کی آواز تھی جس نے سرنگ کھودنی شروع کر دی تھی۔ جلد، اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد، ان سرنگوں میں وہ پانی کے شرّاٹے سے داخل ہونے کی آواز بھی سنیں گے۔

''تم سب کو کیسے یقین ہے کہ یہاں جلد بارش ہو گی اور دجلہ کی سطح بلند ہو جائے گی؟'' برزین نے پوچھا۔

مٹی کے تودے میں کالی آنکھوں کے ساتھ سفید دانت چمکنے لگے۔

''پیغمبرِ عظیم، بہت سے لوگوں نے کل رات آسمان پر مقدس بیل کو دیکھا ہے ...اور وہ دو

مرتبہ ڈکرایا ہے حضور!''

''اوہ!'' مزدک کو یاد آیا۔ یہ دزد کا مہینہ تھا۔ اس کی بعثت کو کب کے سولہ دن گزر گئے تھے۔ لوگوں کے یقین کے موجب سولھویں کی رات کو ہی تو آسمان پر اس نورانی بیل کا ظہور ہوتا تھا جس کے سینگ سونے کے اور کھر چاندی کے تھے۔ وہ بس ایک ساعت کے لیے نمودار ہوتا تھا اور اگر اس سال بارش ہونی ہو تو دو دفعہ ڈکراتا تھا۔

اَوِستا میں ایسا تحریر نہیں تھا، لیکن لوگوں کا یقین نہ جانے کب سے چلا آ رہا تھا۔ مزدک مسکرایا۔ پھر بھی، بارش تو شاید ہوگی، اس کے وطن کا یہ خاص پانی اوپر لانے کا یہ زیرِ زمین نظام کام ضرور آئے گا۔ مزدک اداسی سے بھوکی پیاسی گایوں اور بھیڑ بکریوں کو یاد کرنے لگا جن کی چراگاہیں سوکھ گئی تھیں۔ رسد گاہوں میں غلّہ بس اگلی فصل تک کا رہ گیا ہے، اس نے سوچا ...اب بارش ہونی چاہیے۔ دوسری صورت میں ...وہ سوچ رہا تھا ... ہمیں دوسرے صوبوں سے غلّہ برآمد کرنا پڑے گا اور وہ اس بات کو پسند کریں یا نہ کریں!

''آپ کا لباس میلا ہو گیا مقدس پیغمبر ...'' برزین نے تاسف سے کہا۔

''میلا؟ نہیں نہیں ...'' مزدک نے دُہرایا۔ اس کی شلوار اور قبا پر مٹّی لگ گئی تھی۔ مزدک نے اسے پیار سے چھوا۔ ''یہ اچھی ہے۔ یہ بھی تو مقدس ہے برزین ... آگ، پانی اور ہوا کی طرح۔''

''مٹی مقدس ہے!'' برزین نے دُہرایا۔ پیغمبر یہ اعلان کر چکے تھے۔ گو لوگوں کو اس کی تقدیس پر ابھی پوری طرح اعتبار نہیں آیا تھا۔ خصوصاً آگ کے ساتھ مٹی کا نام لیتے ہوئے ان کو جھجک محسوس ہوتی تھی۔ آگ جو بے حد مقدس تھی۔ لیکن پیغمبر اس کی توضیح اَوِستا کے نسکوں سے کرتے تھے۔

''یہ سارا اناج... مٹی ہی سے تو پیدا ہوتا ہے۔'' وہ بتاتا۔

۱۷

اس روز صبح سے اصطخر کی جانب جانے والے راستوں پر چھوٹی بڑی رتھوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ خوزستان اور شیراز سے، اسپہان سے، اور دور دراز کرمان سے دولتِ ساسانیہ کے پریشان، غیظ وغضب سے بے چین وزرگان، دبیران، موبدان، الغرض امراء کے طبقے کے متعدد افراد کی آمد تھی جن کو گشتاسپ نے کئی دن پہلے دعوت دے کر بلایا تھا۔ صرف وہ ہی نہیں، سلوکیہ کے یسوعی جاثلیق نے بھی کسی طرح دجلہ پار کر کے اصطخر تک پہنچنے کی صورت نکالی تھی۔ مگویان یا مجوسیان بھی اپنے خچروں پر سوار سرخ چغوں میں ملبوس، اپنی پوتھیاں سنبھالے اس مجلس میں شرکت کے لیے اس شہر کی طرف آرہے تھے جو دریائے پلوار کی تنگ وادی میں، ان کے قدیم ترین قبرستان نقش رستم سے ذرا سے فاصلے پر آباد تھا۔ اس کے سرخ گلابوں کا خالص عطر دنیا کے ہر حصّے میں مشہور تھا۔ اسی شہر کے تیار کردہ زربفت سے شہنشاہوں کے ملبوس بنتے تھے جس کی پہاڑیوں میں لوہے اور پارے کی کانیں پوری سلطنت کی ضرورتیں پوری کرتی تھیں۔ لیکن آج اس کے کان کن کام کاج چھوڑ کر اس نئے پیغمبر مزدک کا پیغام سن رہے تھے۔ ان کی نظریں شاندار محلوں اور حویلیوں پر لگی ہوئی تھیں۔ ''یہ پیغام ہے۔ اہورامزدا کا پیغام۔ ملک کی تمام دولت وثروت، تمام لوگوں میں برابر تقسیم کر دی جائے!'' کیا یہ ممکن تھا؟ ہاں ایسا ہو رہا تھا۔ طیسیفون سے یہ خبریں آرہی تھیں۔ مزدک اندوزگر کے پیروان تک پہنچے تھے اور انھیں یہ خبریں دی تھیں۔ ان کا تو کہنا تھا کہ شہنشاہ کی مہرِ خاص کے ساتھ، یہ فرمان شہر کے منصفین تک پہنچا دیا گیا تھا۔

''تب؟ کیا انھیں نئے کپڑے مل سکیں گے؟ کیا ٹوٹے پھوٹے اوزاروں کی مرمت کروائی جا سکے گی؟ کیا مہر کی رقم مل سکے گی کہ وہ شادی کر سکیں؟ فرمان تو آ چکا ہے۔'' لیکن منصف دم بخود ہیں۔ ان کے سوالوں کا جواب دینے کو کوئی تیار نہیں۔

اصطخر صنعت وحرفت کا شہر تھا اور مزدوروں اور کاریگروں سے معمور تھا، مزدک اسی صوبۂ فارس سے اٹھا تھا، اس کے ایک چھوٹے سے شہر مادریا سے۔ یہ ایک مردم خیز مقام تھا۔ یہیں تاریخ نویس تنسر کی حویلی تھی اور شہر کا کتابت خانہ طیسیفون کا مقابلہ کرتا تھا۔ اس کے سرسبز وشاداب باغوں میں ہر شام کسی میلے کا سماں ہوتا تھا۔ شہر کے کنارے ایک چشمے کے کنارے شہنشاہ قباد نے اپنے لیے چھوٹا سا محل تعمیر کروایا تھا، جو آج کل سنسان پڑا تھا۔ قباد کو کب سے یہاں آ کر اپنی ملکہ کے ساتھ

آرام وسکون کے چند دن گزارنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔
اس محل سے بچتے ہوئے یہ مختصر معززین کے قافلے گشتاسپ کی وسیع و عریض حویلی کی طرف آ رہے تھے۔
حویلی کے دالان میں خس کے پردے اٹھا دیے گئے تھے۔ تمام تر دالان بیش قیمت قالینوں سے ڈھکے تھے جن پر گاؤ تکیے رکھے تھے۔ دیواروں پر منقش دیوار گیریاں لٹک رہی تھیں جن میں سب سے نمایاں سواستک کا نشان تھا۔ آریانوں کی شجاعت، بصیرت اور دولت و ثروت کا نشان جو افواجِ مملکت کے اعلیٰ ترین افسران کے ملبوس کی آستینوں پر بھی صفائی اور مشاقی سے کاڑھا جاتا تھا، یہ دو لکیریں تھیں جو ایک دوسرے کے خلاف دو دو زاویوں میں مڑی ہوئی تھیں اور ان کے قدیم ترین معبود سورج کی رتھ اور خود سورج کا نشان تھیں۔ آنے والے اس کو دیکھ کر گردن خم کرتے اور زیرِ لب کہتے ''سواست'' ہاں ہم ہیں اور ہے یہ زمین اپنے سارے خزانوں سمیت، ہمارے لیے! خادمان ان پر گلاب چھڑک رہے تھے۔ ان کی دنیا ابھی نہ بدلی تھی۔ آنے والوں میں دولتِ ساسانیہ کے بڑے نام تھے۔ ان میں سپر ماہ داد تھا، نیوشاپور، وادمزد، آذرفرّ بگ، آذربذ، آذرمہر اور بخت آفرید جیسے علمائے دینِ زرتشت موجود تھے۔ طیسیفون کا موبد موبدان ریشمی چغہ سنبھالے موجود تھا جس کے معبد پر مزدک نے قبضہ جما لیا تھا۔ مملکت کے دونوں یسوعی فرقوں کے بشپ مزدکیوں سے نہایت ہراساں تھے اور وہ اس محفل میں شامل تھے، ان میں باز انیس علم طب سے بھی واقفیت رکھتا تھا اور شاہی معالج رہ چکا تھا۔ ان کے دلوں میں غم و غصے کا طوفان تھا اور ہر شخص کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھا۔ لیکن آدابِ محفل مانع تھے۔ ان سب کی نگاہیں اپنے میزبان گشتاسپ پر مرکوز تھیں۔
ابتدائی تکلفات کو جلد نمٹا کر آخر گشتاسپ کھڑا ہوا اور اس نے کہنا شروع کیا:
''عزیزانِ مملکت۔ آپ واقف ہوں گے کہ صوبہ طبرستان جو کئی نسلوں سے، اشکانیوں کی سلطنت کے اختتام کے بعد ہماری ملک تھا کچھ عرصے سے مزدک فتنے کی زد میں ہے۔ قباد کا پسر کاوس، جسے شہزادہ اور اس کے بادشاہ کو شہنشاہ کہتے ہوئے مجھے اور یقیناً سنتے ہوئے آپ سب کو کراہت محسوس ہوتی ہوگی، وہاں کیا پہنچا کہ کسانوں میں بغاوت پھیل گئی ہے۔ ووستانِ دلبند۔ وہ حویلیوں میں گھس کر لوٹ مار کر رہے ہیں انھوں نے تو...'' اس کی آواز بھرّا گئی۔ ''ہماری عزتوں تک پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ہماری عورتوں...''
سننے والوں نے زور سے آہ بھری۔ ''ناقابلِ برداشت۔'' ہر طرف سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔
''اس فتنے کو کچلنے کے لیے، اس کا خاتمہ کرنے کے لیے آج ہم کوئی منصوبہ سوچنے کے لیے

ہی جمع ہوئے ہیں۔ مجھے شربت کا پیالہ پیش کیا جائے۔'' اس نے خادم سے مخاطب ہو کر کہا۔

خادم نے اسے صندل کا شربت سونے کے کٹورے میں پیش کیا۔ دوسرے بیگاری خادم مہمانوں کو شربت پلانے لگے۔ موبدِ موبدان نے منہ پونچھتے ہوئے کہا:

''آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم نے ہمیشہ وزرگان اور امراء کی پشت پناہی کی ہے۔ قباد کو تو ہم پلک جھپکتے ہی دھر پٹخنے، مگر بدبختی تو یہ ہے کہ سالارِ افواج ان سے مل گیا ہے۔ زرمہر کو ختم کر دیا گیا۔ اب آپ ہی کوئی تدبیر سوچیں۔''

حاظرین میں اب سرگوشیاں ہونے لگیں۔ مہرداد کہہ رہا تھا: ''گشتاسپ، قباد کا شدید دشمن ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔''

''کیوں؟'' یسوعی موبد نے تجسس سے پوچھا۔ وہ اس عہدے پر نیا فائز ہوا تھا اور پایۂ تخت سے دور اسپہان میں رہتا تھا۔ آذرمہر کبھی خود فوج کا افسر رہ چکا تھا۔ اس نے چپکے سے کہا: ''بات یہ ہے کہ فردوس نشیں زرمہر کو گشتاسپ پر ہی سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ اس معاہدے سے جو گشتاسپ نے آپ کے ہم دینوں، یعنی ارمنوں سے کروایا تھا، جنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکا تھا اور لڑائی از سرِ نو شروع ہو گئی تھی۔ ارمنوں نے گزشتہ برس ہی قباد کی فوجوں کو شکست دے دی تھی۔ گشتاسپ پر الزام یہ ہے کہ اس نے اس صلح نامے پر دستخط کرانے کے ارمنوں سے ایک صندوق بھر کر جواہرات لیے تھے۔ بہتر تو خدائے دنیا و دین ہی جانتا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

حاظرین اب ایک پُرجوش بحث میں ہمہ تن مصروف ہو چکے تھے۔ باہر بارش دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ دالان کی چقیں دوبارہ گرا دی گئیں۔ خادموں نے فانوس روشن کرنے شروع کر دیے۔ محفل کے شرکا غم و غصے سے تلملا رہے تھے۔ قباد! قباد! وہ منحوس ساعت تھی جب ہم نے اس کا نام بادشاہ کے لیے تجویز کیا تھا!

''درّہ قفقاز کے ہونان سے مدد لی جائے؟''

''کریشیوں اور تمدری قبائل کو مدعو کریں؟''

''حیرہ کے تنوخ قبائل؟''

''پیغام رسانی کے لیے کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔'' گشتاسپ نے کہا۔ ''ملک کی ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ ہمیں اپنے فرزندوں سے ہی کام لینا پڑے گا۔''

ان کے بیٹے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ پسر مہرداد باپ کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

''بابا! حکم فرمایئے۔'' اس نے کہا۔

بارش تیز ہو گئی۔

۱۸

طبرستان میں ہنگامہ نہیں تھا۔ شہزادہ کاوس کے وہاں پہنچنے پر شہریوں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا تھا، کسانوں اور مزدوروں نے اس کے لیے آنکھیں بچھائی تھیں۔ کاوس نے نہ صرف مزدک کا پیغام بلکہ زمین کی نئی تقسیم کا نظام اور شاہی فرمان منصب داروں تک پہنچا دیا تھا اور صوبے کے ہر کونے میں اس کا نفاذ ہو رہا تھا۔ طبرستان کے چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں زندہ باد دولتِ ساسانیہ اور شاہِ شاہاں قباد پائندہ باد کے نعروں سے گونج رہے تھے۔ صوبے کا خزانہ جو خاندانِ گشتاسپ کی ملکیت میں اس خاندان کی ذاتی تجوریوں میں منتقل ہوتا رہا تھا۔ اب معقول حد تک بھرا ہوا تھا۔ نئے محصولات کا نظام کسی پر گراں نہیں گزرا تھا۔ نارنگیوں، روئی اور چاولوں کی وافر مقدار پیدا کرنے والا یہ صوبہ قباد کو عزیز تھا جہاں کوہِ دماوند تھا اور بے شمار پہاڑوں کے سلسلے۔ کوہِ دماوند جہاں، گئے زمانوں میں کہتے تھے، سیمرغ کا بسیرا تھا۔ قباد کو اور نین دخت کو طبرستان کا ریشم پسند تھا۔ جس کے کیڑے طبرستانی، ملک خطا سے لے آئے تھے اور اب اپنا ریشم بناتے تھے۔ سوتی کپڑے کے تھان اونٹوں پر لدے دولتِ ساسانیہ کی بڑی شاہراہوں پر رواں تھے۔ ان کی مانگ ہر جگہ بڑھ رہی تھی کیونکہ غریب طبقہ اب کپڑے خرید رہا تھا۔ لکڑی اور نرسل کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں کرگھوں پر سوت بنتے جولاہے، جو صدیوں سے آدھے ننگے رہنے پر مجبور تھے، اب اپنے لیے نئے لباس تیار کر رہے تھے۔ قباد ایک عرصے سے وہاں نہ جا سکتا تھا کیونکہ گشاسپ کا خاندان جو طبرستان سے ہی تعلق رکھتا تھا، عرصے سے تقریباً خود مختار تھا اور صوبے کا موبدِ موبدان اس کا قدیمی نمک خوار تھا۔ ''میں کاوس کو طبرستان کا شاہ مقرر کرنا چاہتا ہوں محترم پیغمبر۔'' قباد نے مزدک سے کہا تھا۔ ''اس کی وہاں موجودگی نے طبریوں کے دل میں دولتِ ساسانیہ اور شہنشاہ کے لیے وفاداری پیدا کی ہے۔ رعایا اس کی دانش مندی سے خوش ہے۔''

یہ سن کر مزدک سوچ میں پڑ گیا تھا۔ سچ یہ تھا کہ وہ کاوس کی موجودگی طیسیفون میں زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس نے کافی عرصے سے شہزادے کی تربیت پر بہت توجہ دی تھی۔ لیکن اس نے کہا:

''جیسی آپ کی مرضی شہنشاہِ معظم۔''

قباد اس کے توقف سے بے چین ہو گیا تھا۔ ''آپ کا مشورہ اور قبولیت ضروری ہے۔'' اس

نے کہا۔ برسوں بعد اسے وزرگان اور دبیران اور موبدان سے نجات ملی تھی جو اس پر اپنی مرضی تھوپتے رہتے تھے اور شہنشاہ کو اپنے قیدی یا کٹھ پتلی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ کیا پیغمبر مزدک بھی اس کے اختیار کو محدود کرے گا۔ اس نے شک و شبہے سے سوچا تھا۔ یہ بخوشی اس کی رضا پر سرِ تسلیم خم کیوں نہیں کر رہا؟ تعریف کیوں نہیں کر رہا اس کی دانشمندی کی؟

شہنشاہ اور پیغمبرِ خدا کے درمیان رشتہ نازک ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک دوسرے کی مدد کریں تب ہی ساتھ چل سکتے ہیں، قباد سوچ رہا تھا۔

لیکن یہ شک جلد ہی دور ہو گیا۔

مزدک نے کہا:

''امورِ دولتِ ساسانیہ آپ مجھ سے بہت بہتر جانتے ہیں۔''

قباد مسکرایا۔ وہ اپنے چند مصاحبین اور مزدک کے ساتھ محل کے باغ کے ایک سایہ دار کنج میں بیٹھا تھا۔ خشک سالی کے باعث سوکھی گھاس پر دور تک قالین بچھا دیے گئے تھے۔ قباد کے دل کو سرور محسوس ہوا۔ وہ اپنے سالارِ اعظم سے نصیبین کے دفاع پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

''شاپور مہران کو طلب کیا جائے۔'' اس نے اپنے خادم کو حکم دیا۔

شاپور اپنی حویلی سے ملحق ایک وسیع میدان میں اپنے فوجی دستوں کے سامنے کھڑا تھا۔ میدان میں دستوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔ رنگ برنگے پرچم سپاہِ کیانیاں، سپاہِ گندیشپوریان، ساسانی افواج ایسے سینکڑوں دستوں میں تقسیم تھیں جن کے سوار اور پیادے ایک ہی خاندان کے تھے۔ اس کے ذہن میں جو نیا خیال آیا تھا وہ اس نے اپنے ہزار پتی سالاروں کو بتایا تھا۔

''اگر سپاہ بھی یوں چلا کرے۔'' ایسا اس نے شاہی محل میں ایک طائفے کا رقص دیکھتے ہوئے سوچا تھا جس کے رقاص ایک ساتھ بازو اور قدم اٹھاتے تھے۔

''لیکن رقاصوں کی طرح نہیں۔'' اس نے منہ بنا کر اضافہ کیا تھا۔

''ان کی جنبش سے تو غیظ و غضب ہویدا ہونا چاہیے!''

''ایک جھٹکے سے دایاں بازو سامنے کرو۔''

سپاہیوں نے ایسا ہی کیا۔

''بازو واپس!'' اس نے کہا۔ وہ خود اپنے اعضاء کی جنبش سے اپنی سپاہ کو اشارے دے رہا تھا۔

''اب دایاں بازو اور دائیں ٹانگ بلند کرو۔ سب ساتھ!'' اس نے زور سے آواز دی۔

''اور اب بائیں ٹانگ اور بایاں بازو۔ جھٹکے کے ساتھ۔'' اس نے کہا اور بازوؤں اور ٹانگوں

کو ہلاتا آگے بڑھا۔

سپاہیوں کے دستے آگے بڑھنے لگے۔

شاپور مہران نے خوشی سے ہاتھ ملے۔ اس کے سامنے ایک رعب دار منظر تھا۔ ہزاروں پیادے اس طرح حرکت کر رہے تھے جیسے ایک اژدہام پوری قوت اور نظم و ضبط کے ساتھ پُرعزم آگے بڑھ رہا ہو اور جو عام لوگوں کے لیے قطعی ناقابلِ تسخیر ہو۔

''چہرہ دائیں طرف!''

اس نے جھٹکے سے گردن موڑی۔ دور سوکھی گھاس پر جھاڑیوں کے پاس ایک بڑھیا لکڑیاں چُن رہی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر سالارِ اعظم کو دیکھا تو بھاگ لی۔

شاہی موسیقار نے نقارہ بجایا۔ اس کے ساتھ کھڑے دفدار نے دف پر زور زور سے ضربیں لگانی شروع کیں۔ بہت جلد موسیقار جھٹکے سے اٹھتے گرتے قدموں کا ساتھ دینے لگے۔ یہ ایک یکساں، بارعب تال تھی۔

''بہت خوب، بہت خوب!'' شاپور مہران اپنی ایجاد کی کامیابی پر بہت خوش تھا۔

شہنشاہ کا پیغام پا کر وہ اپنی جگہ ایک ہزار بد کو کھڑا کر کے دوڑا اور گھوڑے پر سوار ہو کر محل کا رخ کیا۔

''ہماری افواج رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار اور مستعد ہیں حضور۔''

شاپور مہران نے دست بستہ قباد کو یقین دلایا — پھر اس نے کچھ تذبذب کے ساتھ اضافہ کیا: ''میں نے تو ان کو یکساں جنبش کرنا بھی سکھایا ہے۔ تاکہ دشمن انھیں دیکھ کر لرزہ براندام ہو جائیں۔''

قباد زیرِلب مسکرایا۔

''تمھارے آنے سے پہلے، ہمیں کسی نے بتایا ہے، بلکہ اس نے تو ہمیں اس طرح جنبش کر کے بھی دکھایا۔''

''بہت خوب!'' شاپور مہران ادب سے مسکرایا اسے لکڑیاں چنتی بڑھیا یاد آئی۔ شہنشاہ کا ذاتی نظامِ جاسوسی مستعد ہے! وہ سن کر مطمئن ہوا۔

''رومی سپاہ بھی اپنی شاہراہوں پر کچھ ایسے ہی کرتب دکھانے لگی ہیں۔ ہم نے سنا ہے جناب شاپور مہران... اور رعایا خوش ہو کر ان پر گلپاشی کرتی ہے۔''

''واقعی!'' شاپور مہران نے تعجب سے کہا۔ ''اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہم ہر لحاظ سے ان کی ٹکر کے ہیں۔''

مزدک خاموش تھا اور سوچ رہا تھا۔ اہورامزدا کی خوبصورت اور سرسبز زمین پر انسان کے لیے چلنے کا اس سے زیادہ غیر فطری طریقہ نہیں ہوسکتا۔ خدائے پاک و بزرگ نے انسان کو اس طرح چلنے کے لیے نہیں بنایا۔ لیکن وہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اسے جو کچھ کہنا ہوتا تھا، اس کے لیے وہ اپنے دل کی بات سیاوش کے کان میں ڈال دیتا تھا جو اس کا پیارا دوست تھا اور اس کے اور قباد کے درمیان سب سے مضبوط پل کی طرح تھا۔ لیکن افواج کیسے چلیں اور کیسے نہ چلیں، اس مسئلے سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ جیسے چاہیں حرکت کریں۔ اس نے سوچا۔

قباد اور سالار اس کی جانب امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''افواج جیسے چاہیں حرکت کریں!'' مزدک نے اداس تبسم کے ساتھ کہا۔ ''وہ ہماری حفاظت کریں۔ ہماری اور دولتِ ساسانیہ کی۔''

شاپور مہران مسرور ہوگیا۔ اس نے دوزانو ہو کر مزدک کی قدم بوسی کی۔ ''یہ ہر لحاظ سے ایک اچھا پیغمبر ہے۔'' اس نے سوچا۔

وہ ایک فتح مند سالار کی طرح محل سے رخصت ہوا۔

۱۹

''چہرہ صاف شفاف، چاند کی طرح چمکدار، گوری۔''

کاتب نرسی نے سبز روشنائی میں قلم ڈبویا اور ذوق وشوق سے لکھنا شروع کیا۔ یہ ایک لمبا، ریشمی فنیقی کاغذ تھا جو اس تک ایسی حالت میں پہنچا تھا کہ اس کے حاشیوں میں کسی اعلیٰ فنکار نے سبز اور گلابی رنگ سے گلاب کی بیل بنا رکھی تھی۔ کاغذ سے کسی اچھے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ نرسی کتابت خانے میں ایک محرابی دریچے کے پاس ایک چھوٹے سے قالین پر چہار زانو بیٹھا تھا۔ دریچے کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور کتابت خانے کے اطراف پھیلے ہوئے چمن سے جاتی بہار کے پھولوں کی بھینی مہک آ رہی تھی۔ ایک دو لمحے وہ باہر دیکھتا رہا، پھر چونک کر لکھنا شروع کیا۔

''جلد، نرم و نازک، آنکھیں کالی، موٹی موٹی اور سرگیں، ناک ابھری ہوئی اور اونچی، باریک ہلکے ہلکے ابرو، انتہائی خوبصورت لمبے گال، قد دل کو موہنے والا، سر کے بال سیاہ اور گھنے، بڑا سر، خوبصورت کان، لمبی گردن، سینہ چوڑا، پستان گٹھے ہوئے۔'' نرسی ایک خط کی نقل محفوظ کر رہا تھا جو حیرہ کے حاکم منذر نے ایک کنیز کے ساتھ بھیجا تھا جو اس نے قباد کو تحفے میں بھجوائی تھی۔ اس خط میں کنیز کے اوصاف بیان کیے گئے تھے۔ شہنشاہ قباد یہ خط پڑھ کر مسکرا پڑا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اسے دیوان میں محفوظ کر لیا جائے۔ اس نے یہ اوصاف دربارِ خاص کے شرکا کو پڑھوا کر سنوائے تھے اور سب ہی اس تحریر سے بہت محظوظ ہوئے تھے۔

''بخدا یہ تو حسن کا معیار مانا جانا چاہیے۔'' ان میں سے ایک نے کہا تھا اور سب درباریوں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

اب یہ سب لکھتے ہوئے دبلا پتلا، نحیف کاتب نرسی ہر سطر پر بل کھا رہا تھا۔

''شانوں کی ہڈیاں پُر گوشت، کلائیاں خوبصورت، ہتھیلیاں نرم، انگلیاں لمبی، بدن پُر لطف، پہلو اندر کی طرف مائل، مقام خاص نزاکت لیے ہوئے، سرین باہر کی طرف مائل، رانوں سے نزاکت ٹپکتی ہے۔ ٹخنے واضح، پنڈلیاں پُر گوشت اور پازیب میں چست ہو جانے والی، نرم خرام، چھوٹے قدموں سے چلنے والی، مجلس میں دل کو لبھانے والی، آقا کی فرماں بردار، باوقار، خاموش طبیعت، نسب بھی شریف ہے۔ خود کو قریبی خاندان سے منسوب کرنے والی باادب، صائب الرائے۔ اس کے

مُنھ کی تھوک انتہائی میٹھی ہے، گھر کو رونق بخشتی ہے۔ اگر تو اس سے ہم بستری کا ارادہ کرے تو بڑے شوق سے تجھے خوش آمدید کہے گی اور اگر تو ہم بستری نہ کرنا چاہے تو تجھ سے باز رہے گی۔ اس کی آنکھیں تیری طرف ٹکٹکی باندھے رکھنے والی ہیں۔ رخسار گلابی رنگ کے ہیں۔ ہونٹوں سے پیار محبت ٹپکتے ہیں اور تیری طرف لپک کر آنے والی ہے۔''

نرسی نے آہِ سرد بھر کر کاغذ لپیٹا۔ اور دوبارہ دریچے سے باہر نگاہیں جما دیں، جہاں دور نیلا آسمان چمن کی حد پر سبز ترشی ہوئی جھاڑیوں سے الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دریچے سے باہر یہ کنیز اسے صاف نظر آ رہی تھی۔ نرسی قلم کا سرا ہونٹوں میں دبائے اسے اپنی مرضی کے طرح طرح کے ملبوسات پہنانے اور اتارنے لگا۔

چادر تلے اس کے ہاتھوں کی مصروفیت دیکھ کر پاس بیٹھے کاتب نے اسے ٹہوکا دیا:

''کیا لکھ رہے تھے؟''

نرسی نے چونک کر اسے دیکھا اور گولائی میں لپٹا کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اوصافِ حسن و جمالِ پری پیکر!'' کاتب نے کہا اور قہقہہ لگایا۔ ''دوست تیرا نصیب! اور ہم سے تو بس تمسکات لکھواتے ہیں۔''

وہ جلدی جلدی تحریر کا مضمون پڑھنے لگا۔ پھر اس نے کہا:

''یہ حیرہ سے آنے والی کنیز کے لیے ہے؟ پھر کیا شہنشاہ نے قبول کر لی۔''

''بہت شوق سے...'' کاتب نرسی نے کہا۔ ''لیکن شاید اپنے لیے نہیں۔ وہ خود تو اپنی ملکہ پر فدا ہے۔ وہ بھی تو ایسی ہی ہے۔''

''تو پھر کیا شہزادے کاوس کے لیے۔''

''شاید...'' نرسی نے کہا، ''لیکن کاوس اب یہاں کہاں۔ وہ تو مزدک کی پیغام لیے دوسرے صوبوں کی خاک چھان رہا ہے۔ تین گھوڑے لے کر گیا ہے۔ باری باری سواری کرے گا۔''

''ملکہ کیا ایسی ہو گی؟'' دوسرے کاتب نے سرگوشی کی۔ ''کیا بچپن کی مشقت نے اس کے ہاتھ سخت نہ کر دیے ہوں گے؟''

تشہیر نہ کرنے کی کوشش کے باوجود قباد کی ملکہ کی داستان سب جانتے تھے حالانکہ کوئی اس کا کھل کر تذکرہ نہیں کرتا تھا۔ ملکہ نین دخت شاہی خاندان کی نہ تھی۔ یہ قباد کی نوجوانی کے ایک شکار کے سفر کی یادگار تھی، جنگل کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے کسان کی دختر، جس پر قباد کی نظر پڑی تھی اور وہ پہلی نظر میں اسے دل دے بیٹھا تھا۔ تب نین دخت چودہ پندرہ برس کی

تھی اور شکاریوں کے لیے گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔ کسان سے وہیں کے وہیں بات طے کر کے قباد اسے شاہی محل لے آیا تھا۔ شادی کی رسومات محل ہی میں ادا ہوئی تھیں۔ قباد کا چھوٹا بیٹا خسرو نین دخت کے بطن سے تھا۔ بڑے بیٹے کاوس کی ماں شاہی خاندان کی تھی۔ قباد کی دوسری شادی کے بعد چند برس میں ہی وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئی تھی اور اس طرح شہنشاہِ دولتِ ساسانیہ کی زنِ پادشاہی نین دخت بن گئی تھی۔ ملکہ دولتِ ساسانیہ ...وہ بہت حسین تھی اور جب سفید موتیوں کا تاج پہن کر، سفید لباس میں شاہی بگھی پر شہنشاہ قباد کے ساتھ طیسیفون کی شاہراہ پر نکلتی تو خلقت اسے دیکھ کر دم بخود رہ جاتی۔

''ہم!'' کاتب نے مضمون ختم کر کے لمبی سانس لی۔ ''یہ حسن و جمال، حیرہ کے کسی کاتب کے تخیل کی کارفرمائی بھی ہوسکتا ہے۔''

''نہیں!'' نرسی نے ناخن چباتے ہوئے بل کھا کر آہ بھری۔ ''تم تو شکّی ہو۔ وہ واقعی ایسی ہوگی۔''

''ہوں!'' کاتب مسکرایا۔ پھر اس نے کہا: ''ایسی سینکڑوں حسینائیں تو اسی طیسیفون کی حویلیوں سے برآمد ہوئی ہیں۔ ارے او نرسی۔ شہنشاہ کی کنیز پر نظر رکھ کر ہولناک موت کو دعوت مت دو اور بھی تو ہیں کئی... ان کو مزدور اور کسان بدبخت اڑا لے جاتے ہیں۔ ارے ہمیں بھی تو کوئی ملے... ہمیں بھی تو... تم تو اب مزدک کے فرامین کی کتابت کرتے ہو۔ کیوں نہیں حاصل کر لیتے ایک۔ اور ہماری بھی سفارش کرو۔''

''چھین جھپٹ کر لینا تو ہم کاتبوں کے بس کی بات نہیں۔ کوئی قانون بن جائے، تو دوسری بات ہے۔ لیکن...'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''پیغمبر نے عورتوں کے لیے تو کوئی قانون ابھی بنایا ہی نہیں۔''

''کہتے ہیں اگلی نشست میں بنائیں گے۔'' کاتب نے خیال آرائی کی۔

''ہاں... یا فرمان آجائے گا... ہم سب منتظر ہیں۔''

کتابت خانے میں دسترخوان بچھا دیے گئے تھے۔ نرسی کے کمرے میں دو تین اور کاتب آچکے تھے اور کھانے میں کیا تھا؟ روز کی طرح سبزی کا آش، دہی اور نان.. گوشت کی توقع اب کسی کو نہ تھی۔ پیغمبر نے گوشت کھانے کی ممانعت کر دی تھی۔ سنا جا رہا تھا کہ شہنشاہ نے بھی گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اور ذائقے کی ہوس میں دوسرے جانداروں کی جان کیوں لیں۔

''فارس میں بارش کی خبریں ہیں... کیا بادل طیسیفون تک پہنچیں گے؟''

طیسیفون کے گلی کوچوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

پیغمبر مزدک صبح سویرے اپنی حویلی سے نکلنا چاہتا تھا، لیکن دروازے میں اسے یاقوت دخت

کھڑی ہوئی ملی۔

''آقا...'' اس نے آہستہ سے کہا۔

مزدک نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں شادی کر رہی ہوں آقا...''

مزدک حیرت زدہ رہ گیا۔

''شادی؟ کس سے؟'' اس نے لمحہ بھر رک کر پوچھا۔

''آپ کے باغ کے مالی سے...'' یاقوت دخت نے نظریں جھکا کر کہا۔

''مالی...! اہواز سے؟'' مزدک نے کہا۔ یہ خبر اتنی اچانک تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور کہا:

''ٹھیک ہے۔ کیا اہواز کے پاس مہر کی رقم ہے؟''

''ہاں... اس نے اپنے حصّے میں آیا ایک قالین فروخت کیا ہے۔''

''ہوں...'' مزدک نے سوچتے ہوئے کہا۔ مہر کی رقم کے بغیر شادی جائز نہ ہوتی اور مزدک دین کے اصولوں پر چلنا کبھی فراموش نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ اب وہ دین کے کچھ نئے اصول بنا رہا تھا۔

''اچھا! ... تم اپنے ماں باپ کو بلا لو...'' مزدک نے دہلیز پار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھاری شادی کر دوں گا۔ تم میری زنِ چگاری تھیں۔ میں نے تم کو آزاد کیا۔''

''تمھارے لیے دوسری عورت لائیں؟'' بامداد نے اس سے دو دن پہلے ہی پوچھا تھا۔

اب مزدک سمجھا۔ بابا جانتے ہوں گے کہ یہ جانے والی ہے۔ اس تجویز پر مزدک نے ہمیشہ انکار کیا تھا۔ ''بیوی موجود تو ہے میری۔'' اس نے کہا تھا۔

''ایک بیوی کافی ہے۔''

بامداد آہ بھر کر خاموش ہو جاتا تھا۔ اس گھر میں وہ اپنی زندگی میں اپنی نسل کو آگے بڑھتا دیکھنا چاہتا تھا۔

یاقوت دخت کی بات سن کر مزدک سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کمرے میں واپس گیا اور قالین پر دوزانو بیٹھ گیا۔ نیچی میز کی دراز سے کاغذ اور قلم دوات نکال کر اس نے لکھنا شروع کیا:

''وزرگان اور امراء کی چگاری بیویاں آزاد کی جاتی ہیں۔ یہ ان غریبوں میں تقسیم کر دی جائیں جو مہر کی رقم ادا نہ کر سکنے کے باعث اب تک شادی نہیں کر سکے ہیں۔ مہر کی رقم ہم ایک درہم مقرر کرتے ہیں۔ جن کے پاس اب تک ایک درہم بھی نہیں، ان کسانوں اور مزدوروں کا مہر سرکاری

خزانے کی طرف سے ادا کر دیا جائے گا۔''

کاتب نرسی اس فرمان کی کتابت کرتے ہوئے آٹھ آٹھ آنسو رویا۔ اس کی بیوی موجود تھی اور وہ کسی حسینہ کا حقدار نہ تھا۔

''یہ ظلم ہے۔'' اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ایک قطعی غیر فطری بات!''

''سینکڑوں برس سے آریہ مرد کئی عورتوں سے لطف اندوز ہوتے آئے ہیں۔ پیغمبر مزدک ... یہ پیغمبر ... شاید، نامرد ہے۔''

''کیوں؟'' نرسی کی بیوی نے مسکرا کر کہا۔ وہ اپنی سات اولادوں کا مُنھ دھلا کر انھیں صاف کپڑے پہنا چکی تھی اور اب سینے پرونے کا پٹارہ کھولے بیٹھی تھی۔ وہ نہالچے سی رہی تھی کیونکہ جلد ہی گھر میں آٹھویں زچگی کی تیاریاں تھیں۔

''مقدس پیغمبر مزدک جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل درست ہے۔ میں اس پر صاد کرتی ہوں۔ کیوں نرسی...'' اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''ہم عورتوں کے کیوں نہیں ایک شوہرِ پادشائی کے علاوہ، کچھ شوہرانِ چگاری ہوتے؟ نہیں! تم ہم کو ہمیشہ بتاتے ہو، ایک عورت کے لیے ایک ہی شوہر بہت کافی ہوتا ہے۔ تو پھر مردوں کے لیے کیوں نہیں۔''

''مزدک کم بخت آدرشی ہے۔'' کاتب نرسی نے ناخن چباتے ہوئے کہا۔

''حقیقت سے دور، بہت دور ہے وہ۔ اب اس کے ذہن سے اس آدرشی پدمنی کا تصور غائب ہو چکا تھا جو اس کے خیال میں، اس کے کسی ہم پیشہ عرب کاتب کے تخیل میں پیدا ہوا تھا اور جو حقیقت سے اتنا نزدیک تھا کہ شاہی محل میں موجود تھا اور طیسیفون کی حویلیوں سے روز برآمد ہو رہا تھا۔''

''آدرشی! ارے تو وہ پیغمبر ہے۔ آدرشی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ نہیں ہم جان و دل سے اس کے ساتھ ہیں۔ زندہ باد... زندہ باد پیغمبر مزدک۔''

''خاموش!'' نرسی نے بیوی کو ڈانٹنے کی کوشش کی۔

''تم کو کوئی جلسوں جلوسوں میں نہیں لے جاتا۔''

مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی خود ایک کاتب کی دختر تھی اور پڑھی لکھی تھی۔ جو کام نرسی کتب خانے سے گھر لے آتا تھا وہ بیوی کر دیتی تھی۔ وہ اسے ناخوش نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ جز بز ہو رہا تھا۔ بہر حال اب اسے دفتر جانا تھا۔

''تم عورتوں کو تحفے میں دے دیتے ہو۔ کبھی ان سے پوچھا... ان کو کون پسند ہے؟ جیسے ان کا دل ہی نہیں... اور ہر ماہ ان کی ہتھیلی پر چار درہم ٹکاتے ہو... اور توقع کرتے ہو کہ ایک درہم مزید نہ

مانگیں... یہ ظلم ہے، اندھیر ہے، ناانصافی...''
بیوی بولے چلی جا رہی تھی۔

کاتب نرسی نے اسے مایوسی سے دیکھا۔ عورتوں میں عقل نہیں ہوتی۔ اس نے سوچا۔ خیر یہ کہاوت تو درست ہے۔ مگر یہ کہاوت کہ وہ بے زبان ہوتی ہیں! ہر گرہست جانتا ہے کہ یہ کہاوت بر خود غلط ہے۔ اصل کا الٹ! آہ!

مزدک جو کبھی مزداد تھا، نامرد نہیں تھا۔

جب اس نے پہلی بار نین دخت کو دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپک گیا تھا۔ نین دخت اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں نہیں آئی تھی، بلکہ اس دروازے سے سیدھی اس کے دل میں اتر آئی تھی۔ اس ایک پل کے ہزارویں حصے میں مزدک نے ملکہ کو اپنی آغوش میں دیکھا تھا۔ اس کے جسم و جان میں نین دخت کے لیے ایک ہوک اٹھ رہی تھی۔ وہ اپنی سوچ میں غرق رہنے والا انسان تھا، نرم خو اور نرم دل۔ نین دخت کے لیے محبت کے الفاظ اس کے ہونٹوں تک نہیں آ سکتے تھے لیکن نظریں اس کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔

واپسی پر خسرو نے کہا: ''مادر، پیغمبر آپ کو کیسے دیکھ رہا تھا؟''

نین دخت گھبرا گئی۔ بچے سب کچھ دیکھتے ہیں اور سب کچھ سمجھ جاتے ہیں، نوشیروان اب چھوٹا نہیں رہا۔ میرا بیٹا، اس نے سوچا تھا۔

''شش۔'' اس نے کہا تھا۔

''کسی سے کچھ نہ کہنا!''

''کیا میں اپنے شوہر کو بتا دوں...'' وہ سوچتی آگے بڑھی۔

''لیکن کیا بتا دوں... کہ اس کی نگاہ میں کچھ میرے لیے تھا؟ نگاہ میں؟ نہیں۔''

وہ قباد کو جان و دل سے چاہتی تھی جو اسے گاؤں سے محل میں لے آیا تھا۔ جہاں پہلے اسے سب کچھ اجنبی لگا تھا۔ کتنے ہی دن وہ اپنی ماں کو یاد کر کے چھپ چھپ کر روتی رہی تھی، لیکن قباد کی دلجوئی نے آخر اس کا دل جیت لیا تھا۔ قباد کی بانہوں میں وہ جوان ہو گئی تھی اور پھر اس با حوصلہ، وجیہہ مرد پر فدا ہو گئی تھی۔ اس کی سرزمین پر اس کی ہم عمر لڑکیوں کی زیادہ تر یہی کہانی تھی۔

یہ پیغمبر اور ملکہ ساسانیہ کے درمیان ایک راز ہی رہے گا، اس نے سوچا اور بیٹے کی بانہہ پکڑے چلتی رہی۔

۲۰

وہ دو تھے اور حیرہ میں اپنے گھوڑے ایک کارواں سرائے میں چھوڑ کر ایک اونٹ پر سوار ہو کر شہر کے جنوب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ حیرہ تک پہنچنے میں ہی انھیں دو دن لگے تھے۔ وہ سیدھے راستے سے نہیں آ سکتے تھے جہاں ان کے پہچانے جانے کا خطرہ تھا۔ یہاں انھوں نے عربوں کے شہر سے باہر زمین کو بدلتے دیکھا تھا۔ اب وہ ریگزار میں تھے جس کا اور چھور نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ یہاں ضرور بھٹک جاتے لیکن ان کا ساربان جو ننگے پاؤں اونٹ کی مہار تھامے ان کے آگے آگے دوڑ رہا تھا جیسے کسی جادو سے سمتوں کو پہچان رہا تھا جو دو ساسانی جوانوں کے لیے غائب ہو سکتی تھیں۔ سرسراتی گرم ہواؤں میں ریت اوپر اڑنے کے بجائے زمین پر اتنی تیزی سے سرک رہی تھی کہ ایک ٹیلہ جو ان کے عین سامنے ہوتا، ان کی آنکھوں کے سامنے غائب ہو رہا تھا اور اچانک ان کی بائیں سمت نمودار ہونے لگا تھا۔

دادار، مہرداد کو اپنے ساتھ لایا تھا کیونکہ وہ اعرابیوں کی زبان سے واقف تھا... کون جانے اس کے اجداد عرب ہی رہے ہوں۔ صدیوں پہلے عربوں نے حملہ کر کے اصطخر پر قبضہ کر لیا تھا۔ لوٹ مار کر کے ان میں سے کچھ واپس چلے گئے تھے مگر بہت سے ایسے بھی تھے جو دولتِ اشکانیان میں بس گئے تھے۔ انھوں نے فارسی حسیناؤں سے شادیاں کر لی تھیں اور اب ان کا علیحدہ شناخت کرنا بھی ناممکن تھا۔ اسی لیے اس جیسے خاندانوں کے لیے اصطخر میں عربی زبان اجنبی نہیں تھی۔

''پانی! پانی!'' دادار نے اوک کا اشارہ کر کے ساربان سے کہا۔

''اب ہم زیادہ دور نہیں۔'' ساربان نے کمر سے چمڑے کی تھیلی کھول کر اوپر اچھالی۔ مہرداد نے اسے لپک لیا۔

''کیا کہتا ہے؟'' دادار نے غٹ غٹ پانی نگل کر پوچھا۔

''اب ہم زیادہ دور نہیں۔'' مہرداد نے دُہرایا۔

اور فاصلے پر انھیں ہریالی نظر آ رہی تھی۔ ایک نخلستانی وادی۔ جوں جوں وہ کھجوروں کے بلند و بالا جھنڈ کے قریب آتے جا رہے تھے، دادار کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

''خدائے دو جہاں ہی جان سکتا ہے!'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''ریت کے اس سمندر میں

اچانک سیاہ زرخیز مٹی کیسے نمودار ہوگئی!''

ان کی دائیں سمت پتھریلے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہوا اچانک معتدل ہوگئی تھی۔ ایک بڑے چشمے کی قل قل کسی نغمے کی طرح ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اب حدِ نگاہ تک پھیلے بنوتنوخ کے خیمے ان کے سامنے تھے۔

ابوعباس ان کا منتظر تھا۔ ان کے آنے کی اطلاع اسے پہلے مل چکی تھی۔ اس کے خیمے کے سامنے ایک بڑی سی دری بچھی تھی۔ ابوعباس ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تپی ہوئی رنگت کا لمبا اور چھریرا ادھیڑ عمر کا بدّو تھا۔ گھنی سیاہ بھوؤں کے سائے میں اس کی لمبی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

مہرداد اور دادار بہت جلد اصل بات تک جا پہنچے۔

''حملہ کر دو! ہماری مملکت پر فوری حملہ...''

ابوعباس ان کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس کے کان ان کی آوازوں پر لگے تھے اور نظریں جن کو وہ گاہے بگاہے جھکا رہا تھا، آنے والوں کے ہر تاثر کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ ''کیا یہ کوئی چال ہے؟'' اس کے دماغ میں پہلا سوال یہی آیا تھا۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا کہ دو آریانی اس کے قیمتی غالیچے پر کس طرح بیٹھے ہیں۔ کب انھوں نے پہلو بدلا اور کیوں؟ کیا بات کہتے ہوئے ان کے شانے آگے کی طرف جھکے۔

آخر اس نے کہا:

''آپ پر عزیٰ کی رحمت ہو۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی مملکت میں لوٹ مار کریں؟''

''اس سے کہو کہ وہ اس بات کو جانے دے... جبکہ سارے ہتھیار ہم اس تک پہنچائیں گے۔ ہم انھیں گھوڑے بھی دینے کا وعدہ کر رہے ہیں۔''

دادار نے بے صبری سے کہا۔

مہرداد سر کھجانے لگا۔

''یوں بات نہیں بنے گی۔'' اس نے زیرِلب کہا۔ ''تم ان بدوؤں کو نہیں جانتے دادار۔ بات کی تہہ تک پہنچے بغیر یہ ایک قدم بھی نہ اٹھائیں گے۔ ہمیں ان کو اصل بات بتانی پڑے گی۔''

''ابوعباس! دولتِ ساسانیہ پر غاصبوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ حکومت ان سے واپس چھین لیں۔''

''کون چاہتے ہیں؟'' ابوعباس نے پوچھا۔

''میرے باپ... اور چچا...'' مہرداد نے بے بسی سے کہا۔

''اچھا!'' ابوعباس نے سر کو جنبش دی۔ ''حکومت تمھارے باپ اور چچا سے چھینی گئی ہے؟''

اب یہ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ بنوتنوخ کا سردار تھا جو اس کا قبیلہ تھا۔ مگر قبیلے میں کفو تھے اور کفو میں خاندان۔

چچا، ماموں، بھائی۔ ان کی عزت، ان کی غیرت، ان کا عصبیہ۔ جس کے لیے ایک بدو جان دے سکتا تھا اور جان لے سکتا تھا۔

''انھیں بتاؤ کہ وہاں ایک شخص امیروں کے مال اسباب چھین کر سب میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔'' داؤدار نے مہرداد کو ٹہوکا دیا۔

''یہ بے سود ہوگا۔'' مہرداد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ان کو تو یقین ہے کہ امیروں کے مال پر ان کا بھی حق ہے۔ اس لیے تو وہ تجارتی قافلوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔''

''ہوں!'' ابوعباس نے کہا، اور آنکھ سے اپنے بیٹوں کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اٹھ کر کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چل دیے۔

''اس مملکت پر ہم نے کئی دھاوے کیے ہیں۔'' ابوعباس نے دونوں آریانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لیکن تمھارا سردار ہمارے ملک منذر کا دوست بن گیا ہے... تب سے ہم نے ادھر کا رخ نہیں کیا ہے۔ اب ہم غسانیوں کے قافلوں پر دھاوا کرتے ہیں۔''

''کیا منذر تمھیں روکے گا؟'' مہرداد نے تشویش سے کہا...

''روکے گا؟'' ابوعباس نے بے یقینی سے دُہرایا... پھر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''اس کا ہم پر کیا اختیار... اجنبی... ہم آزاد ہیں۔'' اس نے لمبا، دبلا بازو ہوا میں لہرایا۔

''تو پھر جاؤ اور طیسفون کے بچے بچے کو قتل کر ڈالو۔'' مہرداد نے جوش سے کہا۔

''ذرا رکو۔'' ابوعباس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم کو شاید غلط فہمی ہے... یہ تلوار۔'' اس نے اپنے لمبے لبادے سے بندھی چمڑے کی نیام کی طرف اشارہ کیا۔ ''صرف اس وقت اٹھتی ہے جب ہماری جان کو خطرہ ہو۔ ہم شوقیہ خون نہیں بہاتے۔ لڑائی میں بھی، تلم بھالا یا تلوار... یہ آخری حربہ ہے۔ پہلے ان کو ہم پر حملہ کرنا پڑے گا...''

''تم ان کو گرفتار کر کے لانا۔ دیوی عزیٰ کی بھینٹ چڑھانا۔'' مہرداد نے اسے اکسایا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوی پر انسانی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔

ابوعباس مسکرانے لگا... ''غیر عرب کی قربانی عزیٰ قبول نہیں کرتی!''

اس نے کہا: ''اس کے لیے ہم بنوغسّان کے بچّے پکڑتے ہیں۔''

بڑی بڑی لوہے کی رکابیوں میں تازہ بھُنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے سروں پر سنبھالے ابوعباس کے بیٹے واپس آ رہے تھے۔ مہمانوں کے لیے ابوعباس نے ایک موٹی تازی بھیڑ ذبح کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں جیسے کسی جادو سے نخلستان کے کھلے آسمان تلے کئی دریاں بچھ چکی تھیں۔ پندرہ بیس بدّو اس بڑی ضیافت میں شریک تھے جو مہمانوں کے لیے کی گئی تھی۔ وہ اپنے گھروں سے دودھ کے گھڑے لائے تھے۔ کھجوروں کا حلوہ۔ زیتون کے تیل کی صراحیاں۔ زیتون کا اچار...

اعرابی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ طیسیفون کی شہر پناہ کی فصیل بہت مضبوط تھی۔ آریانوں نے اسے سیسہ پلا کر بنایا تھا۔ لیکن مغربی کنارے پر جہاں دجلہ بل کھاتا تھا، یہ دیوار نچلی طرف نسبتاً کمزور تھی۔ دیوار کے دونوں طرف دلدلی زمین تھی اور اس طرف کم ہی افواج کا گزر ہوتا تھا۔ یہاں سیندھ لگانا مشکل نہ تھا۔ چمکتے ہوئے ساسانی سکوں کی تھیلیاں ان کے خیموں میں پہنچائی جا رہی تھیں۔

عرب شاعر نے ہاتھ منھ پونچھ کر سریلی آواز میں گانا شروع کیا:

''اے عزیٰ! اے زمین و آسمان کی دیوی۔ رحمت فرمانا۔ رحمت مجھ پر اور میرے بھائی پر۔ اے ملکہ جہاں، اور کسی پر رحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اور محفل بدّوؤں کے بلند قہقہوں سے گونج اٹھی۔ وہ بانہیں پھیلا پھیلا کر اپنے شاعر کو داد دے رہے تھے۔ شاعر جو بدّوؤں کی آنکھوں کے تارے تھے، ان کی قابلِ فخر زبان، جسے سیکھنے حیرہ کے ملک کے بیٹے تک ان کے خیموں میں سالوں سال رہتے تھے، اور جو ان عجمیوں کی، افسوس کہ، سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی تھی۔ بدنصیب! انھوں نے سوچا۔ یہ عزیٰ کی مرضی تھی کہ ان کے سوا دوسری خلقت گویائی کے اس معجزے سے محروم رہے... گویا گونگے اور بہرے! انھوں نے فخر سے سوچا اور رحم کھایا۔

یہ ابوعباس کے گھرانے کی آخری بھیڑ تھی۔ اب اگلے دھاوے تک ٹڈیوں پر گزارا کرنا ہو گا۔ اس نے سوچا۔ چلو یوں ہی سہی۔ مہمان پر سب قربان۔

۲۱

''یہ آریان۔ جو خود کو آریان کہلانے پر مصر ہیں۔ کب کے آریان نہیں رہے ہیں۔''

جوشوا کا استاد اس سے مخاطب تھا۔ وہ کئی دن سے بیمار تھا اور نیک جوشوا اس کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ تکیوں کے سہارے بستر پر بیٹھا ہوا وہ اپنے لائق شاگرد کو وہ باتیں بتا رہا تھا جو وہ جھلی جیسے پتلے چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھتا رہتا تھا۔

''تاریخ ہے میرے پاس... تاریخ۔'' اس نے کہا۔ اس کے کمرے میں چمڑے کی خفیف سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

''یہ تو محفوظ رہنی چاہیے محترم استاد...'' جوشوا نے کمرے میں ادھر ادھر نظر ڈال کر کہا۔ جہاں یہ چمڑے کے ٹکڑے طاقچوں میں بے ترتیبی سے ٹھسے ہوئے تھے اور ان پر گرد کی تہہ جم رہی تھی۔

''محفوظ!'' بوڑھے استاد نے آہ بھری۔ ''دنیا میں کیا محفوظ رہا ہے؟'' اس نے کہا: ''بچ جائے گی اگر کوئی غیر ملکی فوجی دستہ اس شہر کو آگ لگا کر سب کچھ بھسم نہ کر دے... لیکن... مجھ کو معلوم ہے۔ میں نے زندگی بھر یہ تفتیش کی ہے۔''

''سب سے پہلے تو یہاں ایلامی تھے۔ سانولے ایلامی۔'' اس نے انگلی سے ہوا میں تصویریں بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ ان میں مل گئے۔ وہی پرانی بات۔ عورت اور مرد جفت ہونے لگے۔ پھر خطائی یہاں آئے۔ پھر اعرابی آتے جاتے رہے۔ یونانیوں کا تو پوچھو ہی مت۔ عورت کو دیکھتے ہی ان کی رال ٹپکتی ہے۔ وہ بھی جفت ہوتے رہے ہیں۔ اب کہاں کے آریان؟ میرے بیٹے، نسبِ خالص یہودان کے سوا اور کہیں نہیں۔''

''ایلامی تو اب بھی ہیں۔ زیادہ تر ماہی گیری کرتے ہیں۔'' جوشوا نے کہا۔

''ہاں! کچھ جفت ہو کر غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ باقی رہ جاتے ہیں۔''

استاد نے کروٹ لی۔ ''ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیشہ! کہتے ہیں۔''

اس نے دوبارہ ہوا میں انگلی سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ ''بہت پہلے، ہزاروں برس پہلے۔ بہت سے ایلامی ہند کی طرف نکل گئے تھے۔ اپنے دیوی دیوتاؤں سمیت۔''

پھر اس نے قطعیت کے ساتھ کہا:

''یہ صرف ہم ہیں۔ ہم آلِ ابراہیم جنھوں نے اپنے نسب کی حفاظت کی ہے۔''

''بارہ قبیلے!'' جوشوا نے بیزاری سے کہا۔ ''نہ ہم میں کوئی شامل ہو سکتا ہے اور نہ ہم کسی میں شامل ہو سکتے ہیں۔''

بوڑھا کھانستے ہوئے ہنسنے لگا۔ اس نے کہا:

''تم تو شامل ہو رہے ہو آریاؤں میں... جو تم سے ہاتھ ملا کر شاید خود کو پاک کرتے ہیں۔''

''استاد وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ کیونکہ میں صرف اپنے بیٹے، اپنے قبیلوں کے لیے نہیں — سب کے لیے سوچتا ہوں۔ طیسیفون کے مزدور طبقے میں دنیا بھر کے قبیلوں کے غریب غربا رلے ملے ہیں۔ مزدوری کرنے یہاں دور دراز سے لوگ آتے رہے ہیں۔ مزدور کا کیا وطن اور کیا قبیلہ — استاد محترم!''

وہ اب رخصت ہونا چاہتا تھا، اسے ایک احساس اکثر بے چین کر دیتا تھا کہ طیسیفون میں اس کی مقبولیت سے دوسرے یہودی خوش نہ تھے۔ ''تم نے یہودان کے لیے کیا کیا؟'' ان کی نظریں یہ سوال پوچھتی نظر آتی تھیں۔

استاد سے رخصت ہو کر وہ اپنے آریان دوست کے گھر کی طرف چل پڑا۔ دانا زاد جو اس کی طرح مکتب کا استاد تھا۔ وہ چل بسا تھا اور جوشوا اس کے لیے بہت اداس تھا۔ وہ اس کی بیوی اور بچوں کو پُرسہ دینے جا رہا تھا۔ دانا زاد اس کی طرح مزدک کی تحریک کا پرجوش حامی تھا۔ معمولی بخار نے اس کے عزیز دوست کی جان لے لی۔ جوشوا نے تاسف سے سوچا۔

گھر پر اداسی چھائی تھی۔ دانا زاد کی بیوی سرنگوں بیٹھی تھی۔ اس گھر میں وہ پہلی بار آیا تھا۔ موت کے گھر میں تواضع نہیں کی جاتی۔ وہ سادہ پانی کا گلاس پی کر وہاں سے اٹھ آیا۔ دہلیز پر اسے ایک سات آٹھ برس کی بچی نظر آئی۔

''آداب بجا لاتی ہوں۔'' بچی نے خم ہو کر کہا۔

''کون؟ دانا دخت؟ تم دانا زاد کی بیٹی ہو؟'' اس نے دانا زاد سے اس کا ذکر سنا تھا۔

''ہاں! چچا۔''

بچی نے کہا — وہ غور سے جوشوا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے سیاہ بالوں کو، فراخ پیشانی کو، اس کی سیاہ، زیرک، چمکدار آنکھوں کو۔

جوشوا نے جیب سے ایک درہم نکال کر اسے دیا۔

''اس کی مٹھائی کھانا دانا دخت۔''

''نہیں!'' بچی نے کہا۔ ''یہ میں پیغمبر مزدک کو دے دوں گی۔''

''اوہو! تم جانتی ہو پیغمبر مزدک کو۔''

''ہاں! میرے بابا بتاتے تھے۔'' بچّی نے کہا۔

پھر وہ گلی کی طرف چل دی جہاں اس کی ہم جولیاں اسے کھیلنے کے لیے بُلا رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر ایک بار جوشوا کو دیکھا اور پھر گلی کی بھیڑ میں گُم ہوگئی۔

جوشوا اس طرف دوبارہ کبھی نہیں گیا، اور نہ اس کو وہ بچّی کبھی نظر آئی۔ دانا زاد کا نسب کبھی کمبوچ رہا تھا۔ جوشوا یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا۔ کوئی بخا منشی شاہ کمبوچ رہا تھا... وقت کے ہاتھ نے قبائلیوں کو خلط ملط کر دیا۔ اور روزگار نے انھیں زمین پر جا بجا، اَن گنت سمتوں میں بکھیر دیا۔ استاد غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جوشوا نے سوچا۔ خالص النسل تو کوئی بھی نہیں رہا ہے۔

۲۲

شاپور مہران کی سپاہ نے دو دن کے اندر ہی تین یہودیوں کو گرفتار کر کے اس کے سامنے لا پٹخا۔ سپاہیوں نے ان کو دجلہ پار سلوکیہ سے گرفتار کیا تھا۔ وہاں ان کے چند افراد عورتوں کا بھیس بدل کر پہنچے تھے اور یہودیوں کے محلّے میں خدمتگاری کے بہانے رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ اس بڑی حویلی میں داخل ہو سکے تھے جہاں یہودیوں کا صوبہ سلوکیہ میں یہودیوں کی علیحدہ سلطنت بنانے کا منصوبہ رچ رہا تھا۔ یہ تین یہودی بھی اسی منصوبے کی جزیات سننے میں شامل تھے۔ وہ ساسانی فوج کے یہودی دستے میں شامل تھے اس لیے وہ ان کو پہچان سکے تھے۔ مجلس سے باہر نکلنے کے بعد سپاہیوں نے ان کا تعاقب کیا تھا اور انھیں دھر پکڑا تھا۔

''انھیں قید خانے میں بند کر دو۔'' سالارِ اعظم نے حکم دیا۔ وہ فوراً اس سازش کو شہنشاہ کے سامنے بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد شاپور مہران نے فوری اجازت حاصل کر کے شہنشاہ کی خلوتِ خاص میں حاضری دی۔ قباد اس وقت اپنے منجھلے بیٹے خسرو کے ساتھ پیغمبر مزدک اور سیاوش سے مملکت کے کچھ اہم امور پر گفتگو کر رہا تھا۔

شاپور مہران کی باتیں سن کر قباد متفکر ہو گیا۔ ''تو یہودا کے دل میں یہ سمایا ہے...'' اس نے سوچا یہ کوئی دنیا سے نرالی یا انوکھی بات نہ تھی۔ اتنی عظیم مملکت کے کئی حصّے اس سے پہلے بھی خودمختاری کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کی سرکوبی بھی لازمی تھی۔ دولتِ ساسانیہ کی رعب دار سپاہ اس کام کو بخوبی سرانجام دیتی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے خسرو کی طرف نظر ڈالی، گویا کہتا ہو: ''اے پسرِ عزیز... تیرے ورثے پر ڈاکا ڈالنے والے اپنے بھی ہوں گے اور غیر بھی...''

خسرو نے باپ کی نگاہوں کا جواب ایک خاموش نگاہ سے دیا اور ادب سے نظریں جھکا لیں۔ اس کی نگاہوں میں عزم اور ارادہ تھا۔ قباد نے مطمئن ہو کر سالارِ اعظم کی طرف دیکھا۔

''سلوکیہ کے باغی یہودیوں کے لیے آپ کی افواجِ قاہرہ کے دس دستے ہی کافی ہوں گے۔ لیکن ان قیدیوں کے ساتھ عبرت انگیز سلوک ضروری ہے تاکہ پھر کسی کو اتنی ہمت نہ ہو کہ دولتِ ساسانیہ کو ضرر پہنچانے کی کوشش کرے۔''

شاپور مہران سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

''حضور اجازت دیں تو ان کے جسموں میں میخیں ٹھکوا کر موت سے ہم کنار کیا جائے۔ بدترین مجرموں کو یہی سزائیں دی جاتی ہیں۔''

مزدک اب تک خاموشی سے تمام گفتگو سن رہا تھا۔ سالارِ اعظم کی تجویز سن کر اس کے رُخ کا رنگ اچانک زرد ہو گیا۔ اس کی سیاہ آنکھیں زخمی کبوتروں کی طرح ادھر ادھر چکرانے لگیں۔

''نہیں... ن... نہیں ...'' اس نے پھنسی ہوئی آواز میں کچھ ہکلاتے ہوئے کہا۔

''اذیّت مت دو ...'' وہ ہاتھ کا سہارا لے کر قالین سے اُٹھ کھڑا ہوا ... ''مت پہنچاؤ اذیت کسی جاندار کو ...ان کے منہ سے نکلی ہر چیخ عرش کو ہلا دے گی۔ ہم اہرمن کی پیروی کر رہے ہوں گے ... کسی جاندار کو اذیت مت دو۔''

قباد اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص، جس نے خود کو پیغمبر کہنا شروع کر دیا تھا، اس کا محسن تھا۔ اب بھی، جبکہ رعایا ہر محل اور ہر حویلی پر قبضہ کر رہی تھی اور وزرگان و بزرگان کو صلواتیں سنا رہی تھی، اس کا محل محفوظ تھا اور رعیت اس کے گُن گا رہی تھی۔ قباد، مزدک کو پسند کرنے لگا تھا۔ مگر سیاوش سے ضبط نہ ہو سکا۔ ''فضول کی باتیں نہ کرو۔'' یہ الفاظ اس کی نوکِ زباں تک آئے تھے لیکن اس نے انھیں واپس نگل کر کہا۔

''مقدس پیغمبر ... آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ سزائے موت کو آپ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اب اذیّت دینے کی بھی مخالفت کر رہے ہیں۔ پھر آخر سزا کیسے دی جائے۔''

مزدک کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا: ''قید خود بڑی سزا ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھیے۔ یہ فرمان جاری کر دیجیے کہ آج سے، آپ کے مہربان راج میں، مجرموں کو اذیّت دینا موقوف کیا جاتا ہے۔''

کمرے میں ہر شخص دم بخود بیٹھا تھا۔ وہ بڑی عمر کے تجربہ کار منتظم تھے اور گہری سوچ میں تھے۔ صرف کم سن خسرو کے چہرے پر شدید حقارت کا تاثر تھا جس کو چھپانے کی اس نے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ گردن جھکائے وہ خاموشی سے ہونٹ چبا رہا تھا۔ رخصت کے وقت جب قباد نے اسے پیغمبر کی قدم بوسی کا حکم دیا تو اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''عالم پناہ! میرے سر میں سخت درد ہے۔''

قباد گھبرا گیا۔ وہ اپنے اس خوبرو اور فرمانبردار بیٹے کو بہت چاہتا تھا جو اس کی آنکھوں کی نور ملکہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اس محبت کی نشانی جو پہلی نظر میں اس کے دل میں جاگزیں ہو گئی تھی۔

''ارے! کیا ہوا ... ہم حکیم برزویہ کو بلاتے ہیں۔''
''اجازت ہو تو میں کچھ دیر آرام کروں؟''
خسرو نے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہا۔
''کیوں نہیں!'' قباد نے فوراً جواب دیا۔
شہزادہ الٹے پاؤں دروازے سے نکل گیا۔
سیاوش، مزدک کے ہمراہ گھر کی سمت چلا۔
''مزداد!'' اس نے رتھ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''شہزادہ خسرو تم کو ناپسند کرتا ہے۔''
''ہوں ...'' مزدک نے کہا۔ ''روحِ خیر کی روحِ شر پر بالآخر فتح ہوگی عزیز از جان یار!''
سیاوش مسکرایا مگر اس کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔ اپنے رتھ کے دریچے سے بانات کا پردہ ہٹا کر وہ محل سے باہر تیزی سے گزرتے ویرانے کو دیکھ رہا تھا۔ مزداد، جو اب پیغمبر مزدک کہلاتا تھا، اس کے پیغمبر ہونے پر سیاوش کو ذرا بھی یقین نہیں تھا۔ پیغمبر تو شاید مانی تھا ... سیاوش سوچ رہا تھا، جس کا برسوں پہلے خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ پیغمبر کوئی ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جس کا وجود ماضی کے دھندلکے میں پہنچ کر نورانی ہو گیا ہو۔ اپنے درمیان رہتے، چلتے پھرتے، اپنے جیسے انسان کو پیغمبر آخر کوئی کیسے سمجھ لے! وہ مسکرایا۔ طیسیفون کے بے شمار باسیوں کی طرح وہ بھی مزدک کو ایک اصلاح کار سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ اور اصلاح؟ نتائج کچھ ایسے بُرے نہ تھے۔ سیاوش نے دوبارہ دور دور تک خالی میدان پر نظر دوڑائی۔ پہلے یہاں بلبلاتے بھکاریوں کے غول منڈلاتے رہتے تھے۔ اب یہاں ایک بھی بھکاری نہیں تھا۔ خشک سالی تو اب بھی جاری تھی لیکن شہر کے غریبوں کو دو وقت جَو اور گندم کا دلیہ مل رہا تھا۔ اب کسی کے صرف بھوک سے سسک سسک کر جان دینے کی خبر نہیں آ رہی تھی۔ بیماری سے موت؟ پھر تو اہورامزدا کی رضا ہے۔
''جب انصاف ہوگا، تو نہ پھر کوئی جرم کرے گا اور نہ جنگ کی ضرورت رہے گی۔''
اسے اپنے دوست مزداد کی بات یاد آئی۔
''خیر... وہ تو دیکھا جائے گا۔'' سیاوش نے بے پروائی سے سر ہلا کر سوچا۔ اس کے مخبروں نے تو ابھی تازہ تازہ اسے دجلہ پار سلوکیہ میں یہودیوں کی بغاوت کی سازش کی خبر دی تھی۔
جنگ تو اب لازمی ہو سکتی تھی۔

۲۳

''کیوں... ابّا... کیوں؟''

جوشوا باپ کے کتب خانے میں دوزانو قالین پر بیٹھا تھا۔

''کس لیے چاہتے ہیں ہم ساسانی مملکت سے خود کو علیحدہ کر کے اسے نقصان پہنچانا؟'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

اس کا باپ قندیل کی زرد روشنی میں ایک کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر جوشوا پر ڈالی اور پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیکن جوشوا اپنے سوال کا جواب چاہتا تھا۔

''ایرانیوں نے کیا نہیں کیا ہمارے لیے؟ یہ تاریخ تو خود آپ نے مجھے بچپن سے سکھائی ہے۔ ہم یہودیان تو آریان کے پاس سات آٹھ سو برس سے ہیں۔ جب سے بخت نصر نے ہمیں یروشلم سے نکالا، جب سے رومیوں نے ہیکل سلیمانی مسمار کیا۔''

جوشوا دم لینے کو رکا ...اس نے باپ کے چہرے کو غور سے دیکھا جس پر قندیل کی زرد روشنی سایوں کا کھیل سا کھیل رہی تھی۔ اس کا بوڑھا جھریوں سے بھرا چہرہ ساکت تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس نے آنکھیں موند لی ہیں۔

جوشوا نے سوچ سوچ کر اسے یاد دلانا شروع کیا۔

''شہنشاہ کوروش نے پناہ دی تھی ہمیں، اس نے ہمیں یروشلم واپس جا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی بلکہ مدد کی تھی ہماری... اور یہودیان نے وہ تعمیر کر ڈالا تھا۔''

''پورا نہیں بنایا تھا ...ایک محراب کم تھی۔''

''پارتھیوں نے بھی ہمارا خیال رکھا تھا ابّا'' جوشوا نے کہا۔ ''آریان نے ہم میں سے ایک منصب دار چنا، ریشگالوت کا لقب دیا اسے۔ وہ ہم سب کا مذہبی پیشوا ہے۔ وہ اپنی مجلس کے ساتھ ہمارے قضیے فیصل کرتا ہے۔ یہودیان، دولتِ ساسانیہ میں [حضرت] موسیٰؑ کے قانون کے تحت رہتے ہیں ابا جان۔''

جوشوا اپنے باپ سے پہلوی میں بات کر رہا تھا۔ عبرانی وہ تقریباً بھول چکا تھا۔

اس کے باپ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''یہودیان نے آریان کی فوجوں میں شامل ہو کر اپنی جانیں دی ہیں۔ اے فرزند... اس مملکت کو بنانے میں ہم نے بھی خون دیا ہے۔''

''اور صدیوں سے ہم نے ان کے لیے لگان اور جزیے اور محصول بھی جمع کیے ہیں۔ لیکن فوجی اور غیر فوجی خدمات کے عوض ہر حکومت نے یہودیان کو جاگیریں بھی تو دی ہیں۔''

''جوشوا...!'' اس کے باپ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایک شہنشاہ جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے۔ بہرام نے کتنے یہودیان کو سولی پر لٹکایا؟ ساسانی مملکت کا سرکاری دین زرتشتی ہے۔ ایسا اعلان کر دیا ساسانیوں نے۔'' وہ پھر کتاب پر جھک گیا۔

''آریان نے ہمیں پناہ دی۔''

''وہ رومیوں کے خلاف اپنی ہمیشہ سے جاری جنگ میں ہمیں اپنا اتحادی بنانا چاہتے تھے۔''

''اور یہودیان نے تو اسپہان پر حملہ کر کے قبضہ بھی کر لیا تھا۔''

''انھوں نے کسی کو معاف نہیں کیا تھا۔ سینکڑوں یہودیان کی کھال کھنچوا دی تھی۔''

''آپ صرف بری باتیں ہی کیوں یاد رکھنا چاہتے ہیں ابا۔'' جوشوا نے زچ ہو کر کہا۔

''اور تم کس خواب و خیال میں ہو؟'' اس کے باپ نے کہا۔ کتاب بند کرتے ہوئے وہ جوشوا کی سمت رخ کر کے بیٹھ گیا۔

''ابّا! یہاں تو کرستیان بھی آرام سے اور حفاظت سے رہ رہے ہیں... جبکہ آپ جانتے ہیں۔ وہ رومیوں کے خلاف آریان کے اتحادی نہیں ہیں اور نہ بن سکتے ہیں۔''

''ہاں...'' بوڑھے نے لمبی، ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ان کی بات اور ہے۔ عیسائیوں سے آریان مرعوب رہنے لگے ہیں، جب سے رومی عیسائی ہو گئے... ایک بہت بڑی مملکت جو عین ان کے دروازے پر ہے، ان کی ہم مذہب ہے۔ آریان ان عیسائیوں کی خوشنودی حاصل کیے رہنا چاہتے ہیں۔''

وہ فرش پر بچھے قالین کو دیکھنے لگا جس کے بیچوں بیچ انگور کی ایک بیل بنی تھی جو قالین کو دو تکونوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ اس بار اس نے نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''دیکھیں سلوکیہ میں کیا ہوتا ہے... اور اس کے بعد... اس کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

جوشوا کی ماں دروازے سے داخل ہوئی۔ اس نے لمبا سرخ چوغہ پہن رکھا تھا اور بالوں پر

سفید رومال باندھا ہوا تھا جس نے اس کے کھچڑی بالوں کو بالکل ڈھانپ رکھا تھا۔

''چلو کھانا کھالو...'' اس نے دھیرے سے کہا۔

بوڑھا عصا کے سہارے کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ بیوی اور بیٹے کے پیچھے چل پڑا۔ ضعیفی نے صاحبِ خانہ کے رعب داب کو کافی کم کر دیا تھا۔ اب تو مدت ہوئی اس نے حساب کتاب کا کام بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی جگہ جوشوا نے لے لی تھی، جس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا!

''ہمیں تمھاری فکر کھائے جاتی ہے جوشوا۔''

''میری فکر!'' جوشوا نے دوسرے کمرے میں بچھے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ نہ ہو گا... اور آپ کو بھی۔ ابا آپ گھر پر رہتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں... یہ لوگ ... یہ لوگ آریان ... یہ مزدور، کسان، کاریگر ... آپ کے بیٹے کو کتنا چاہنے لگے ہیں۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں... لیکن... کتنے تو میرے لیے جان دے سکتے ہیں۔''

جوشوا نے کہا اور شرمندہ ہوا۔ ''کیا وہ شیخی بھری بات کہہ رہا ہے؟''

''ہاں ہاں! سنتا رہتا ہوں۔'' اس کے باپ کی آواز میں لرزش تھی۔

''وہ تجھے ناپاک یہودی نہیں کہتے؟'' ماں نے پوچھا۔ اس نے بڑی قاب سے بھنے ہوئے گوشت کا پارچہ کاٹ کر جوشوا کی طرف بڑھایا۔

''اوں ہوں...'' جوشوا نے نفی میں سر ہلایا۔

''کبھی نہیں!'' اس نے بھرے مُنھ سے کہا۔

شاپور مہران دو دن بعد دجلہ پار کر کے سلوکیہ پہنچا۔

ان دو دنوں اور دو راتوں میں اس کے کئی دستوں نے سلوکیہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ تیسری صبح جب سلوکیہ کے باسی بیدار ہوئے تو تمام یہودیوں نے اپنے مکانوں پر نشان لگے دیکھے جو تیز سرخ کھریا مٹی سے لگائے گئے تھے۔ رات کی رات شاہی فوج کے جاسوسوں نے یہ خدمت انجام دی تھی۔ ساسانی مملکت کے ہر بڑے شہر میں سرکاری جاسوسوں کا جال بچھا تھا جن کے کچھ مصنوعی کاروبار بھی تھے۔ یہ صرف پلکیں جھپکنے سے ایک دوسرے کی شناخت کر لیتے تھے۔

صبح سویرے سے یہودیان کو ان کی حویلیوں، مکانوں، جھونپڑیوں سے ہانک ہانک کر ایک میدان میں جمع کرنا شروع کیا گیا۔ سالارِ اعظم بہ نفسِ نفیس، ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ان کے سامنے تھا۔ ان میں سربرآوردہ سو افراد کو ایک چھوٹے صحن میں لایا گیا۔

شاپور مہران ان دو دنوں میں غور کرتا رہا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ اس

نتیجے پر پہنچا تھا کہ جسمانی تشدد کے کئی طریقے محض اضافی تھے اور تشدد کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا تھا۔ اصل بات تو مجرم کے دل میں خوف پیدا کرنا ہوتی ہے۔

''بدبخت یہودیو...'' اس نے گرج کر کہا۔ ''ناہنجار اور ناشکرے... جیسے کہ تم ہو...'' اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس کے سامنے کچھ جانے پہچانے چہرے آئے۔ جاگیردار، جو اس کو دعوتیں کھلا چکے تھے، حساب دان... جو فوج کا حساب کتاب لکھتے رہتے تھے... والیانِ محصول... جن کے بغیر حکومت کا کام چلنا دشوار تھا۔ لیکن اپنی آنکھوں میں شناسائی کی ذرّہ برابر جھلک پیدا کیے بغیر اس نے سخت لہجے میں بات جاری رکھی۔

''وہ کون سی آسائش ہے جو تم کو ہماری مملکت میں میسر نہیں؟ تمھاری سازش کی اطلاع پایۂ تخت تک آناً فاناً پہنچ گئی۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم کسی بات سے ناواقف رہ سکتے ہیں۔ دولتِ ساسانیہ کو ضرر پہنچانے کی ہر کوشش کو ہم کچل کر رکھ دیں گے۔''

سالارِ اعظم نے رک کر گھوڑے کی گردن تھپتھپائی جو بے چینی سے سر ہلا رہا تھا۔ پھر اس نے حاظرین پر نظر ڈالی جن کے چہرے فق تھے۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اس مملکت سے تم کو رومیوں کی سلطنت میں دھکیل دیں؟ وہ یسوعی ہیں۔ وہاں وہ تم سے چن چن کر اپنے بڑے جاثلیق یسوع کو صلیب پر چڑھانے کا بدلہ لیں گے۔ خوب خوب بدلہ!'' اس نے چابک زمین پر پٹکا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اور اس نے اگلے سُم زمین پر پٹکے۔ لیکن شاپور نے رانوں کے دباؤ سے اسے قابو میں کر لیا۔

''تمھارے تین سازشی ساتھی جو ہماری افواج کے دستہ یہودان میں تھے، گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ ان کی مشکیں کس کر انھیں پہاڑوں پر گھسیٹا جائے گا یہاں تک کہ تمام گوشت ادھڑ جائے اور انھیں باندھنے والی رسیوں میں ان کی نسوں کے سوا کچھ باقی نہ بچے۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ پھر اس نے کہا:

''اور تم لوگ! اپنے محلّوں سے نکلنا اور آپس میں باتیں کرنا تمھارے لیے ممنوع کیا جا رہا ہے تاوقتیکہ ہم دوسرا حکم جاری کریں۔ کورنش بجا لاؤ!''

سرخ اینٹوں کے احاطے میں کھڑے تمام یہودی سجدے میں گر گئے۔ شاپور مہران گھوڑا موڑ کر احاطے سے باہر آیا اور اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ اس دھمکی کا اثر خاطر خواہ ہو گا۔ پھر بھی اس نے چند خصوصی دستے سلوکیہ میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا، جو سرحدوں کی حفاظت کر سکیں۔ اس نے اپنی فوج کے یہودی دستوں کو صوبہ فرگیون میں تعینات کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا

جہاں کی زیادہ تر آبادی کرستیان تھی اور جو ان سے نفرت کرتے تھے۔ ''اب ان کو ارمنوں سے واسطہ پڑے گا۔'' شاپور مہران نے سوچا۔ ''دولتِ ساسانیہ کے صوبۂ آرمنیا کو آریان فرنگیون ہی کہتے تھے جہاں آئے دن نت نئی شورشیں سر اٹھاتی رہتی تھیں۔''

دوسرے دن صبح سویرے افواجِ ساسانیہ کا سالارِ اعظم واپس آ گیا۔ چند ساتھیوں کے لیے اس نے آبِ دجیل کے اس مشرقی کنارے پر آریان کے آباد کیے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں بغداد میں ضرور قیام کیا جہاں کی نہایت خستہ کھجوریں اسے بہت پسند تھیں اور جن کا لذیذ حلوہ بنایا جا سکتا تھا۔ کئی بوریوں میں کھجوریں سمیٹ کر اس کے فوجی دستوں نے دجلہ پار کیا۔

۲۴

شاپور مہران کی روانگی کے بعد سجدہ ریز یہودیان نے سر اٹھایا اور اپنی پیشانیوں سے خاک صاف کی... ان کے ضعیف مذہبی پیشوا مارزترا نے انھیں آنکھ کے اشارے سے گھر کے اندر آنے کو کہا۔

اس وقت وہ مارزترا کی حویلی میں ہی تھے جو سلوکیہ میں یہودان کی خوبصورت ترین عمارت تھی۔

''میرے بچو!'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ ''مجبوری میں سر جھک سکتے ہیں لیکن دل نہیں... دل مضبوط رکھنا مقدس ابراہیم کی اولادو۔''

کمرے میں ایک کشادہ دری پر تکیوں کے سہارے بیٹھے یہودان باادب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کا ایکزی لارک تھا، ایک نام جو ارمنوں نے جلاوطن یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں کو دیا تھا اور جو اب خود یہودیوں کی روزمرّہ میں شامل ہو گیا تھا۔ فارس اور طیسیفون کے یہودی مارزترا کو خصوصی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے جس کے جواں سال بیٹے ہونا ماری کو ساسانی شہنشاہ پیروز کی سپاہ نے مار دیا تھا۔

''قباد کے سر میں یہ نئی دھن سمائی ہے کہ دنیا کو الٹ پلٹ کر دیا جائے۔ وہ مزدک کے سحر میں گرفتار ہو گیا ہے جس کا اصرار ہے کہ تمام امراء کی دولت لوگوں میں برابر تقسیم کر دی جائے۔ اس کے آدمی مُصر ہیں کہ یہودی اس دین کو تسلیم کر لیں... ہم اپنے مذہب کی حفاظت کریں گے میرے بچّو۔''

''بزرگ محترم۔'' ایک جواں سال تاجر نے کہا۔ ''کیا وہ ہمیں مذہبی آزادی دینے کے وعدے سے منکر ہو رہے ہیں۔''

مارزترا چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے نپی تلی آواز میں کہا: ''ابھی تو نہیں۔ لیکن وہ وقت بہت دور نہیں ہے جب ہمیں اپنے امر و نہی پر چلنے کی اجازت نہیں ہو گی۔''

یہودی سوچ میں تھے۔ ان کے بزرگوں نے انھیں بتایا تھا کہ ایرانی حکومتیں ہمیشہ سے ایسی نہ تھیں۔ اصطخر کے ایک چھوٹے سے آتش کدے کے موبدوں نے اپنی جھوٹ موٹ کی رشتے داری اشکانی شہنشاہوں سے ثابت کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا اور ساسانی بادشاہوں کے دور کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہی شہنشاہ تھے جنھوں نے دولتِ ساسانی کا سرکاری مذہب دین زرتشت ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اب گاہے گاہے ان کا کوئی مذہبی جنونی شہنشاہ ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کرنے

کے لیے اپنے ہرکارے بھیج دیتا اور ان کی عزّتِ نفس مجروح ہو جاتی۔

''قباد نے اس سے پہلے بھی دخل اندازی کی ہے۔ میشنا کا واقعہ، تم بھولے تو نہ ہو گے۔'' مارزترا نے کہا۔

میشنا کا واقعہ اس لیے مشہور ہوا تھا کیونکہ قباد کے سپاہیوں نے طریقِ یہودان سے اس مذہبی گناہ گار کو سزا دینے کے بارے میں تفتیش شروع کر دی تھی۔ میشنا ایک زرتشتی لڑکی پر مرمٹا تھا۔ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا لیکن ان کے درمیان جنسی تعلقات قائم ہو گئے تھے جس کے گواہ اس کے کئی محلّے والے تھے۔ احکاماتِ مذہب یہودا کے مطابق اس بدبخت لڑکی کا قتل واجب ہو گیا تھا لیکن اس پردیس میں، جہاں مقامی قوتیں بالادست تھیں، وہ زرتشتی لڑکی کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے، لیکن ان کو اس گناہ کی پاداش میں ایک یہودی کو سزا دینے کا پورا حق تھا۔ مارزترا کے حکم پر میشنا کو بیس کوڑے مارے گئے تھے لیکن غدارِ مذہب میشنا نے سلوکیہ کے حکام سے شکایت کر دی تھی اور قباد کے کارندے تفتیش کرنے آ پہنچے تھے اور بااثر یہودیوں کو مہینوں پریشان کرتے رہے تھے۔

''یہودیوں سے تمھارے اپنے قاعدے اور شرح کے مطابق محصول لینے پر ہم دخل اندازی نہیں کرتے لیکن جہاں تک جان لینے یا اذیت پہنچانے کا تعلق ہے تو مملکت کی سرحدوں میں ایسے کسی بھی عمل میں ہم ضرور دخل دیں گے جو دبیران اور عاملوں کی اطلاع یا اجازت کے بغیر کیا جائے۔'' یہ ان کا اصرار تھا...

ان ساسانی ہرکاروں کو تو زرِ خالص کی ایک سلاخ دے کر ان سے پیچھا چھڑا ہی لیا تھا، لیکن گاہے گاہے ''سب کے لیے ان کا اپنا مذہبی قانون'' کے متبادل ''ایک مملکت، ایک قانون'' کا نعرہ ہر چند سال بعد سنائی دینے لگا تھا۔ بعض ساسانی بادشاہوں نے مذہبِ زرتشت کو سلطنت یکجا اور مضبوط رکھنے کا کارگر وسیلہ سمجھا تھا اور ان کی دلی خواہش یہی معلوم ہوتی تھی کہ دولتِ ساسانیہ کے تمام باشندے زرتشتی ہو جائیں۔

''یہ گمراہ اس قوم کو نہیں مٹا پائیں گے جن کو الھیوم نے اس دنیا کو درست کرنے کے لیے خود منتخب کیا ہے۔''

مارزترا نے ایک محکم یقین سے کہا۔ محفل کے حاظرین نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ دنیا کو درست کرنے کے لیے منتخب قوم ہونے پر کسی یہودی کو نہ اعتبار تھا اور نہ انھیں اس کی پروا تھی۔ لیکن وہ بے یقینی کی اس کیفیت سے عاجز تھے جو صدیوں سے ان کا مقسوم تھی۔ زرتشتی مذہب قبول کرنے کی صورت میں وہ ان اختیارات اور حقوق سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے جو یہودی ہونے کی وجہ سے انھیں

حاصل تھے۔ زرتشتی کسان، کاریگر یا غلام کی حالت ان سے بدتر ہی تھی... اور پھر مذہب بدلنے والوں کا حشر ایک ہجوم میں گُم ہو جانے کے سوا اور کیا تھا؟ عین اس وقت بھی، جبکہ ان کے سیکڑوں غریب غربا روز مزد کی مذہب اختیار کر کے طیسیفون کا رخ کر رہے تھے، ہزاروں یہودی اپنی شناخت بچانے کی فکر میں تھے۔ موعودہ سرزمین تک تو وہ نہ جانے کب پہنچ سکیں لیکن فی الحال ان کو اپنی آزاد اور خودمختار مملکت کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو...

''کیا تم میرے ساتھ ہو میرے بچّو!'' مارزترا نے پوچھا۔

کمرہ حاظرین کی بلند آوازوں سے گونجنے لگا۔

''ساتھ ہیں — ہم آپ کے ساتھ ہیں مقدس ایکزی لارک۔''

''ہمیں محاذہ کا رخ کرنا ہے۔ راتوں رات نکل چلو۔'' ان کے ایکزی لارک نے کہا۔

محاذہ طیسیفون کے نواح میں پھیلی یہودیوں کی بہت بڑی بستی تھی۔ سلوکیہ کے برعکس وہاں نصرانی نہیں رہتے تھے جو ان کے کبھی اتحادی نہیں ہو سکتے تھے۔

مجمع ایکزی لارک کی حویلی سے ایک عزمِ بالجزم کے ساتھ روانہ ہوا... ''صرف نہتوں پر ظلم کرنا سیکھا ہے آریان!'' ان کے دل کہہ رہے تھے۔ ''آؤ اور یہودی جوانوں سے لوہا لو!''

آنے والے مہینوں میں، محاذہ اور اس سے منسلک علاقے مملکتِ ساسانیہ میں یہودیوں کی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کرنے والے تھے۔ افواجِ ساسان کے یہودی دستے جوق در جوق ان سے آملے تھے اور محاذہ کی سرحدیں سیسہ پلائی دیوار بن گئی تھیں، جس سے شاپور مہران کے فوجی دستے ٹکراتے رہنے پر مجبور تھے۔ محاذہ کے گرد شہریوں نے تیزی سے دیوار کھڑی کر دی تھی اور ان کی کدالوں نے اس کے گرد ایک گہری خندق کھود ڈالی تھی جو اتنی وسیع تھی کہ ساسانی سواروں کے گھوڑے انھیں طویل سے طویل چھلانگ لگا کر بھی پار نہیں کر سکتے تھے۔

''ہم سے ٹکر لینے والے واصلِ جہنیوم ہوں گے۔'' مارزترا چوک میں اعلان کرتا...

''واصلِ جہنیوم!'' جوان کدالیں لہرا کر جواب دیتے۔ جہنیوم! جہاں ان کے عقیدے کے مطابق آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، جو گناہ گاروں کو جلا کر خاک کر دیں گے... ارے ایسی خطرناک اور بری چیز کی یہ زرتشتی پرستش کرتے ہیں! وہ سوچتے۔ ہزاروں! لاکھوں لوگ۔ سچ ہے الہیوم جسے گمراہ کرے!

یہودان کے سربراہ ساسانیوں کو شکست دینے کے بعد ساسانی دربار کے طرز پر ایک چھوٹی سی دولتِ یہودان بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے، جبکہ ان کے شہنشاہ کی ''بہت زیادہ بیویاں'' نہ

ہوں گی، جیسا کہ توریت میں فرمان ہے۔ بس مناسب تعداد میں ہوں گی۔

ان کے امراء اور تاجر اپنی دو دو، اور تین تین، اور اگر جیب میں رقم ہو تو چار چار بیویوں پر قانع تھے۔ مارزترا صاف الفاظ میں کہتے تھے۔ ''دو چار بیویوں کے بعد نہیں... کم سے کم کچھ عرصے بعد ایک بار تو ہر بیوی کے پاس جا سکو۔ اور توریت کے اور ربائیوں کے فرمان کے مطابق، سب کا گھر علیحدہ رکھو۔ انھیں ساتھ نہ رکھنا... عقل کا بھی یہی تقاضا ہے۔''

''ہمارا مذہب عین فطرت کے مطابق ہے۔'' ایکزی لارک فرماتے تھے۔ ''نصرانیوں نے اپنے طریقے رائج کر دیے ہیں۔ لیکن انسان کی ضرورت اور یہودیوں کو تو نہیں بدلا جا سکتا۔ اس سے پہلے بھی، جب یسوع نے نصرانیوں کا شوشہ کھڑا نہ کیا تھا دولتِ روم میں، ہیروڈ نے پہلی بیوی رکھتے ہوئے دوسری شادی کی تو قوانینِ یہودیان کے تحت ہی اسے جائز بنانا پڑا تھا۔'' وہ اپنے عقیدت مند سننے والوں کو یاد دلاتے۔

۲۵

''یہ ہوا کا قانون ہے۔''

مزدک نے اپنے حلقوم پر ہاتھ رکھ کر جوانی سے کہا، بہت دنوں بعد وہ آج عرفانیوں کی خانقاہ کی طرف آ نکلا تھا۔ زندگی کی مصروفیتوں نے اسے مہلت ہی نہ دی تھی کہ وہ دل کی گہرائیوں میں چھپے احساسات لوگوں کو بتا سکتا۔ وہ دن کا زیادہ وقت جوشوا کے ساتھ گزارتا تھا، جب جوشوا مکتب سے واپس آ جاتا۔

جوانی عرب استھان سے آیا تھا۔ وہ بدّو نہیں تھا، حیرہ کے ایک عطریات کے تاجر کا بیٹا تھا۔ خوشبودار لکڑیاں، پتھروں اور جڑی بوٹیوں سے لدا اونٹ لے کر وہ طیسیفون کے نواح میں پہنچا تھا اور ایک کارواں سرائے میں ٹھہرا تھا۔ دوسری صبح اس نے دیکھا تھا کہ اس کا سارا مال و اسباب رات کے کسی پہر میں چُرا لیا گیا تھا۔

''میرے اونٹ کو کسی نے دیکھا ہے؟'' وہ دو تین دن طیسیفون کے گلی کوچے میں راہگیروں سے پوچھتا پھرا تھا۔ پایۂ تخت کے چالباز باسیوں نے اس کے سوال کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ جوانی کا دل دنیا سے ہی اٹھ گیا۔ وہ کس مُنہ سے وطن واپس جاتا۔ اس کا تاجر باپ تو پہلے ہی اسے نالائق کہتا تھا۔ جوانی نے عرفانیوں کی خانقاہ میں پناہ لی تھی۔ پودوں کو پانی دیتے ہوئے، اسے حیرت ہوئی تھی، اس کے دل کو کہیں زیادہ سکون ملا تھا، جتنا کہ اسے اپنا مال فروخت کر کے، دینار و درہم کی تھیلیاں بٹور کر گھر واپس لوٹتے ہوئے نہ ملتا۔ یہاں اسے دو وقت گندم اور جَو کا دلیہ مل جاتا تھا۔ اور آج۔ آج زرتشتیوں کا نیا پیغمبر ادھر آ نکلا تھا۔ جوانی دست بستہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''سنتے ہو؟'' مزدک نے کہا، پھر وہ ہنسنے لگا۔ ''ہاں ہاں! سنتے ہی تو ہو گے — میں نے کہا اور تم نے سنا!''

جوانی ان کی بولی تھوڑی بہت سمجھنے لگا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ مزدک نے کہا:

''یہاں!'' مزدک نے دوبارہ حلقوم پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ جائے امکان ہے۔ بے حد، بے انتہا امکان۔ پوری کائنات کی تھرتھراہٹ، وقت اور خلا کی، زمان و مکان کی سب سے پہلی تھرتھراہٹ۔ ان پہ گرج رہی ہے یہاں... یہاں سے کائنات کی پیدائش ہوئی۔''

''آواز!'' مزدک نے کچھ رک کر کہا۔ ''الفاظ۔ جو مُنھ سے نکل رہے ہیں۔ میں کو میں اور تم کو تم بناتے ہیں۔''

''عزیٰ کے کرشمے!'' جوانی کے مُنھ سے بے ساختہ نکلا۔

پاس کھڑے ایک دوسرے عرفانی نے مسرت سے قہقہہ لگایا۔ ''تم عزیٰ کو یاد کرتے ہو؟ ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ ہم عزیٰ کی مورت بنائیں گے۔ ہم سنگتراش کو بلا بھیجیں گے۔'' جوانی نے تشکر سے عرفانی کو دیکھا۔ شرمندگی ایک ایسا احساس تھا جو اس عمارت کی چہار دیواری سے باہر کہیں رہ گیا تھا۔ یہاں اسے کسی بات پر کوئی شرمندہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن زرتشتیوں کا نیا پیغمبر عرفانی نہیں تھا۔ اس نے دنیا کو قبول کرنے کی جگہ دنیا بدلنے کی ٹھانی تھی...

''انصاف، انسان کی روح کا تقاضا ہے۔'' مزدک نے کہا۔

''مگر۔'' عرفانی نے تذبذب سے کہا۔ ''شہر میں امراء کا مال و اسباب تو آپ کی اجازت سے مزدوروں اور کاریگروں نے چھین لیا ہے۔ چھینا کیوں گیا؟''

''کیونکہ وہ اپنی خوشی سے نہیں دے رہے تھے۔'' مزدک مسکرایا۔

''اس لیے چھیننا پڑا۔''

پھر اس نے کہا: ''طیسیفون میں لوٹ مار بند ہو چکی ہے عزیز عرفانی — جوشوا نے حساب دانی کی ہے اور شہنشاہ نے قانون بنا دیے ہیں۔''

''مگر دوسرے شہروں سے لوٹ مار کی خبریں آ رہی ہیں۔'' عرفانی نے کہا۔

''بند کروا دیں گے شہنشاہ قباد!'' مزدک نے انھیں یقین دلایا۔

''کس بنیاد پر یقین ہے آپ کو؟ جب ایک بار لوٹ مار شروع ہو گئی تو اسے ختم کون کرائے گا۔''

''شاپور مہران!'' مزدک نے مسکرا کر کہا۔

عرفانی مسکرانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ مزدک اہورا مزدا کا نام لے گا۔

''زندہ باد، شاپور مہران!'' عرفانی نے کہا۔

مزدک دھیرے قدموں سے واپس آنے لگا۔ شام کو اسے شاپور مہران سے ملنا تھا۔ جوشوا کے بعد، یہ خوش مزاج اور خوش نیت سالارِ اعظم اس کا سب سے اہم سہارا تھا۔

۲۶

''خوں ریزی کے بغیر افواج کو قائم رکھا جائے! ایسا کیسے ممکن ہوگا...'' سالارِ اعظم اپنی خواب گاہ میں، نرم وگداز بستر پر لیٹا ہوا غور کر رہا تھا۔ شہنشاہ قباد نے اپنے چہیتے پیغمبر کی ایما پر یہی حکم دیا تھا۔ اس کے مخالف طعنہ زن تھے۔ وزرگان اور دبیران ہنس رہے تھے۔ ''یہ کیسا بادشاہ ہے جو خون بہانے سے ڈرتا ہے۔ بزدل!'' وہ آپس میں مذاق کرتے۔ ''دولتِ ساسانیہ تو اب گئی سمجھیے۔ کوئی بھی طالع آزما چرواہا اسے دو چھڑیاں مار کر اس سے حکومت چھین لے گا۔''

''یہ درست نہیں تھا!'' شاپور مہران نے کروٹ بدل کر سوچا۔ ''میرے جیتے جی تو نہیں۔'' حالانکہ حالات مخدوش تھے... یہودان کی سازش دبانے کے لیے اس کی افواج محاذہ کی چار سرحدوں پر برسرِ پیکار تھیں۔ یہودی جم کر لڑ رہے تھے۔ ان کے زہر میں بجھے تیروں کی بوچھاڑ زرہ بکتروں کو کاٹ دیتی تھی۔ ''میری سپاہ کو تازہ کمک کی ضرورت ہے۔'' شاپور مہران نے سوچا... بدوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے البتہ اس کی سپاہ کی تربیت نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک باقاعدہ فوج تھی جسے سپاہِ ملکِ روم کے مقابلے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ لنگوروں کی طرح قلانچیں مارتے اور آن کی آن میں غائب ہونے والے اور اچانک سرو کے جھنڈ سے نمودار ہونے والے بدوؤں کے لیے نہیں۔ شاید اس کو ہنانی قبائل سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ بدوؤں سے خوب نبٹ لیں گے۔

شاپور مہران نے چراغ کی بتی نیچے کی... قالین پر پرچھائیاں حرکت کر رہی تھیں۔ شاپور مہران نے پہلے تو بے توجہی اور پھر غور سے دیکھا۔

وہ دو تھے۔ دو پرچھائیاں۔ شاپور نے تڑپ کے کروٹ لی۔

''کون؟ کون ہے؟'' لیکن اس کی آواز اس کے گلے میں گھٹ گئی۔ دشمن اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا تھا۔ دوسرے حملہ آور کے مضبوط ہاتھ نے اس کے منھ میں کپڑے کا گولہ ٹھونس دیا۔ ایک خنجر اس کی گردن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاپور مہران نے تکیے پر سر پٹکنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں زخمی کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ اس نے سینے پر چڑھی پرچھائیں کو ایک جھٹکے سے پٹخنے کی کوشش کی، لیکن خنجر نے اسے مہلت نہ دی جو مشاقی سے اس کے نرخرے کو کاٹتا ہوا تکیے تک پہنچ گیا۔

شاپور مہران کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلی اور اس کے بریدہ سر نے دائیں طرف سے حرکت کی۔ اس کے گلے سے نکلنے والی خرخراہٹ کپڑے کے گولے میں جذب ہوگئی۔

''بدبخت غدار...'' خوابگاہ میں ایک پھنکارتی سرگوشی ابھری۔ ''وقت نہیں کہ تجھے نو موتوں کی سزا دیتے۔''

خواب گاہ میں معمولی سرسراہٹ ہوئی، پھر اتھاہ خاموشی چھا گئی۔

۲۷

طیسفون سے پانچ دن کی مسافت پر شہر زردوق سے تھوڑی ہی فاصلے پر ایک ایسا موڑ تھا جس کے بعد سنگِ خارا کا یہ بلند قلعہ دور ہی سے نظر آنے لگتا تھا۔ یہ تھا قلعۂ فراموشی، جس کا نام لینا بھی مملکتِ ساسانیہ میں ممنوع تھا۔

اس کی جانب ایک چھوٹا سا قافلہ جا رہا تھا۔ کل پچیس شہسوار جو مملکت کے شہنشاہ قباد کو قلعۂ فراموشی کی طرف لے جا رہے تھے۔ وہ رات کو طیسفون سے نکلے تھے اور دن خیموں میں گزارنے کے بعد رات کو ہی سفر کرتے تھے۔ یہ سوفرا کی وفادار سپاہ کے چنیدہ جاں نثار تھے۔ انھوں نے اپنے چہرے دبیز سیاہ نقابوں سے ڈھانپ رکھے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ناموں سے بھی واقف نہ تھے۔

کل تک جو اتنی وسیع مملکتِ ساسانیہ کا شہنشاہ تھا، مدبران اور وزرگان کی رضا سے معزول کیا جا چکا تھا اور اب اس کا مقسوم یہی تھا کہ بقیہ عمر قلعۂ فراموشی میں گزار دے۔ مملکت میں اس کا نام لینا بھی ممنوع کر دیا گیا تھا۔

سفر کے دوران جب ضرورت پڑتی تو دن کے وقت ان میں سے کوئی ایک شہر سے تازہ سبزیاں، پھل، پان اور گوشت خرید لاتا۔ زردوق میں یہ سامان لانے میں دیر لگی۔ خوراک بر کے لوٹنے میں کافی وقت لگا۔ فوراً کھانے کی تیاری کرتے ہوئے پہریداروں کو یہ احساس بھی نہ ہو سکا کہ ان کا بھیجا ہوا سوار درختوں کے ایک جھنڈ میں بندھا پڑا ہے۔ اس کے گھوڑے پر سوار، اس کے کپڑوں اور نقاب میں کوئی اور ہے۔ یہ سیاوش تھا جو تین دن سے قافلے کے تعاقب میں تھا۔ اس پالکی کی جستجو میں جس میں اس کا محبوب شہنشاہ سوار تھا۔ سیاوش نے آخری دم تک اپنے شہنشاہ سے وفاداری کا عہد کیا تھا۔ اور اب وہ یہ عہد نباہ رہا تھا۔

قباد اپنی پالکی کے پاس ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں دور افق میں کھبی ہوئی تھیں۔ گشتاسپ اور اس کے ساتھیوں نے اصطخر سے طیسفون آنے میں ایک دن کی بھی دیر نہیں کی تھی۔ اس کے سالار شاپور مہران کے قتل سے فوج میں جو انتشار پھیلا تھا، اس کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ جاگیری دستوں کے ساتھ محل میں داخل ہو گئے تھے۔ انھوں نے قباد کو اس کی خوابگاہ میں قید کر دیا تھا۔ جاماسپ نے یہ منظر کانپتے ہوئے ایک زرنگار پردے کی اوٹ سے دیکھا

تھا۔ وہ محل سے فرار ہو جانا چاہتا تھا، لیکن گشتاسپ کے سپاہیوں نے اسے پہچان لیا تھا۔

''عالی جاہ! آپ کہاں چلے؟'' گشتاسپ نے اس سے بڑی عزت و احترام سے کہا تھا۔

''عالی جاہ؟'' جاماسپ، سوچتا رہ گیا تھا۔ تو کیا اب تاجِ شہنشاہی اس کے سر پر رکھا جائے گا؟ چودہ برس کا جاماسپ سراسیمہ ہو گیا تھا۔

''اور قباد؟ اس کا کیا حشر کیا جائے؟'' گشتاسپ کی تجویز تھی کہ اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔

''مگر عالی جناب... خلق میں وہ غیر مقبول نہیں۔ اس کے قتل سے ہنگامہ برپا ہو سکتا ہے۔'' وزرگان نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

نئے مقرر کردہ مدبرانِ موبد نے تب ان کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی۔ ''قباد کو قلعۂ فراموشی میں قید کر دیا جائے۔ وہ تا عمر وہیں رہے گا۔ اس کا نام لینا بھی ممنوع ہو گا۔ رفتہ رفتہ وہ خلق کی یادداشت سے محو ہو جائے گا۔''

کچھ پس و پیش کے بعد وزرگان نے اس تجویز کو قبول کر لیا تھا۔

اور اب اسے گشتاسپ کے سپاہی اس کی آخری منزل کی طرف لے جا رہے تھے۔

''آخری منزل!'' قباد نے سوچا اور اپنے جسم میں گرم خون دوڑتا محسوس کیا۔ وہ صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ ان المناک دنوں میں بھی وہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا تھا کہ اس کا جسم کمزور نہ پڑے۔ وہ تہیہ کر چکا تھا کہ اس قلعے میں وہ زیادہ دن نہیں گزارے گا۔ وہ فرار ہو جائے گا، نئی فوج بنائے گا۔ اپنی مملکت واپس لے گا وہ... مگر کیسے؟ ابھی تک کوئی تدبیر اس کے ذہن میں واضح نہیں ہوئی تھی۔

ایک پہریدار نے کھانے کی قاب اس کے سامنے رکھتے ہوئے قباد کے ہاتھ کو نرمی سے دبایا۔ قباد نے چونک کر پہریدار کی طرف دیکھا۔ نقاب کے پیچھے سے دو چمکدار، مسکراتی بھوری آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں کو وہ کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ قباد کی آنکھیں چمک اٹھیں جیسے دیکھنے والے کی نگاہوں کی روشنی خود اس کی آنکھوں میں سرایت کر گئی۔

''سیاوش!''

یہ محبوب نام اس کے ہونٹوں میں دبا رہ گیا۔ سیاوش نے سر کو جنبش دی اور فوراً پلٹ گیا۔ دوسرے پہریداروں پر نظر ڈال کر اس نے اطمینان کیا کہ شہنشاہ اور اس کے درمیان سر کی خفیف جنبش کا تبادلہ کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔

قباد فرحت اور اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ سیاوش اس کے ساتھ ہے۔ اب یہ خبر نین دخت تک

بھی پہنچ جائے گی کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن خود نین دخت کہاں ہے؟ مملکت کی ملکہ شہزادے خسرو کے ساتھ محل سے غائب تھی۔ محل پر قبضے کے دو دن بعد جاماسپ کی تاجپوشی کے دن بھی سپاہی اسے تلاش نہ کر سکے تھے۔ ان کے کارندے شہزادے اور ملکہ کی تلاش میں طیسیفون کا چپّہ چپّہ چھاننے میں مصروف تھے لیکن شہر میں اچانک پھیلی بدنظمی میں وہ انھیں ڈھونڈ نہ پائے تھے۔

قلعۂ فراموشی!

ایک بلند و بالا محراب میں داخل ہو کر وسیع و عریض ایوان، جس کی دیواروں پر طلائی اور نقرئی پچی کاری سے بیل بوٹے بنے تھے۔ کئی وسیع کمروں کے دروازے اس ایوان میں کھلتے تھے جو آپس میں دروازوں کے ذریعے منسلک تھے۔ ایوان سے پرے ایک چوکور بڑا کمرہ جو شاید کبھی کسی بادشاہ کا دیوان خاص رہا ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک باغ تھا جس کے بلند درخت کاٹ دیئے گئے تھے تاکہ ان کے پیچھے کوئی چھپ نہ سکے۔ لیکن نرم و نازک بیلوں اور پھولدار پودوں کی فراوانی تھی۔ تروتازہ سبزے سے زمین ڈھکی ہوئی تھی۔ باغ کے آخری سرے پر باورچی خانے اور ملازموں کی کوٹھریاں تھیں۔ کمروں میں آرام دہ نشستیں اور بستر تھے۔ آرام دہ کرسیاں تھیں اور طاقوں میں آرائشی پیالے اور رکابیاں رکھی تھیں۔ اہم شاہی قیدیوں کے لیے مخصوص یہ زندان آرام دہ تھا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ یہاں رہنے والے تکلیف محسوس نہ کریں اور فرار ہونے کی خواہش ان کے دلوں میں کم سے کم تر پیدا ہو۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی ان کی آخری آرام گاہ تھی۔ دخمے پر رکھ کر ان کی نعش یہیں چھوڑی جاتی تھی اور شکاری پرندے ان کے وجود کے ٹکڑے اپنے بدن اور خون کا حصّہ بنا لیتے تھے۔ اس پہاڑی پر اور آس پاس کے درختوں پر گدھوں کے جھنڈ صبر اور تحمل سے آنے والوں کا انتظار کرتے تھے۔ اس درمیان وہ آس پاس کے دیہاتوں کا رخ کرتے رہتے جہاں ان کے پیٹ بھرنے کا سامان میسر تھا۔

یہاں کون، کب آیا۔ قباد کو بھی یاد نہیں تھا۔ اس قلعے کے قیدیوں کا ذکر ممنوع رہا تھا اور یہ طریقہ اتنا کامیاب تھا کہ ان کے نام سب کے حافظوں سے محو ہو چکے تھے۔

۲۸

نین دخت ایک بڑی سیاہ چادر میں چہرہ چھپائے مزدک کی حویلی میں داخل ہوئی۔ وہ ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہوکر آئی تھی جسے ایک خچر کھینچ رہا تھا۔ اس کا بیٹا خسرو اس کے ساتھ تھا، جسے وہ گاڑی میں ہی باہر چھوڑ آئی تھی۔ چوب دار اسے نہ پہچان سکا۔

''آپ کون؟'' کے جواب میں نین دخت نے کہا:

''بامداد بابا جان کو اطلاع دو۔ ان سے ملنے ان کی خالہ آئی ہے۔''

چوبدار کچی نیند سے اٹھا تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے بامداد کے دروازے پر دستک دی۔ بامداد نے دروازہ کھولا تو نین دخت نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ بامداد کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

''ملکہ عالیہ!'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''بابا جان!'' نین دخت نے کہا۔ میں پیغمبر کی بیوی سے ملنا چاہتی ہوں۔

بامداد نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ غیر معمولی زمانے تھے۔ شہنشاہ قباد کو جلاوطن کر دیا گیا تھا اور ملکۂ سلطنت ایک بوسیدہ سیاہ چادر لپیٹے اس کے گھر آئی تھی۔

''دینگ... میری بھتیجی...'' بامداد نے کہا۔

''گھر کے اندر تو نہیں... باہر کوٹھری میں ہے۔ وہ...'' بامداد نے کچھ رک کر کہا... ''ان دنوں ناپاک ہے دینگ۔''

''ناپاک...!'' نین دخت نے سوچا۔ اس کے ذہن میں اب ایک پوری ترکیب مرتب ہو رہی تھی۔

چوبدار نین دخت کو حویلی کے باہر، ایک کمرے کی طرف لے چلا۔ اس نے فرش پر لاٹھی بجا کر مالکن کو بیدار کیا۔

دینگ ننگے فرش پر سو رہی تھی۔ پاکی کا غسل کرنے تک اس کے لیے مسہری پر سونا گناہ بنا دیا گیا تھا۔ نین دخت نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ دونوں عورتیں کمرے کی دیوار سے لگی دو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''میرے پاس وقت نہیں دینگ۔'' نین دخت نے کہا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک ملکہ کی طرح بولنے سے روک نہیں پا رہی تھی۔ حالانکہ اس لمحے اس کے دل و دماغ میں اپنے قباد کے سوا کچھ نہ تھا۔

''فرمایئے ملکۂ عالیہ...!'' دینگ نے کہا۔ اس کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔

طاق پر چراغ رکھ کر چوبدار کمرے سے باہر چلا گیا۔ نین دخت نے کہنا شروع کیا: ''عزیز دوست... میں نے معلوم کر لیا ہے کہ شہنشاہ کہاں ہیں۔ میں انھیں آزاد کرانے کی کوشش کروں گی۔ لیکن شہر سے نکلنے کے لیے مجھے بھیس بدل کر جانا ہوگا۔'' پھر اس نے دینگ کو غور سے دیکھ کر پوچھا:

''اور... پیغمبرِ محترم کہاں ہیں دینگ؟''

دینگ کے چہرے پر ایک سایہ سا چھا گیا۔

''مجھے علم نہیں ملکہ...'' اس نے کہا۔ پھر اس نے سنبھل کر نین دخت پر توجہ کی۔ ''میں حاضر ہوں ملکہ... میں کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی؟''

''تم کچھ دن کے لیے روپوش ہو جاؤ۔ مجھے اپنے کپڑے اور اپنی گاڑی دے دو۔ میں طیسیفون سے دینگ بن کر نکل جاؤں گی... مجھے خوزوں کے شہر جانا ہے۔ خوزستان۔ وہیں قلعۂ فراموشی ہے۔ جان کی بازی لگا کر دینگ، شاید میں شہنشاہ کو اس شہر سے نکال سکوں۔''

دینگ گھسٹتی ہوئی کمرے کے ایک گوشے میں رکھے صندوق کے پاس گئی۔ اس نے اپنے کپڑے نکالے اور ایک چادر میں لپیٹ کر نین دخت کو تھما دیے۔

ملکہ نے اپنا ایک لباس دینگ کے بستر پر چھوڑ دیا۔

''میری گاڑی کل صبح آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ یا آپ رات یہاں قیام فرمائیں گی؟''

''نہیں...'' نین دخت نے کہا۔ ''صبح شہزادہ گاڑی لینے آ جائے گا۔'' اس نے جھک کر دینگ کے رخسار پر بوسہ دیا۔

''تمھارے عارضے کا مجھ کو بہت افسوس ہے۔'' نین دخت نے خلوص سے کہا۔ نرم دل ملکہ دینگ کی معذوری سے دکھی ہو گئی تھی۔

''اس لیے تو مزدک کو اپنی زنِ پادشائی سے محبت نہیں۔'' اس کے دماغ کا ایک گوشہ سوچ رہا تھا۔

نین دخت کمرے سے باہر جانے لگی۔ تب اچانک اس نے مڑ کر دینگ کو دیکھا۔

''تم ناپاک ہوتی ہو، دینگ... تب تو تم ماں بھی بن سکتی ہو... پیغمبرِ محترم نے...'' وہ اتنا کہہ

کر خاموش ہوگئی۔ اس نے جملہ پورا نہیں کیا جو اس کے منہ پر آیا تھا۔ ''کوشش کیوں نہ کی۔''
دینگ آنکھیں پھیلائے نیم اندھیرے میں ملکہ کو کمرے سے رخصت ہوتا دیکھتی رہی۔
حویلی سے کچھ فاصلے پر دیوار کے ایک جھنڈ میں کھڑی خچر کی گاڑی میں خسرو ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں پر زمین کھودنے والے مزدوروں کی طرح مٹی مل رکھی تھی اور چہرے کو ایک سیاہ کپڑے سے ڈھک رکھا تھا جو اس نے سر پر لپیٹا ہوا تھا۔
''دیر کردی مادرِ محترم!''
''اے جانِ مادر... انھیں سب کچھ بتانا بھی تو تھا۔'' نین دخت نے پیار سے اپنے بیٹے پر نظر ڈالی۔ ''پیغمبرِ محترم تو گھر پر نہیں تھے۔''
''پیغمبرِ محترم!'' خسرو نے حقارت سے کہا۔ ''اگر ہوتا تو شاید آج میں اس کا یہیں خاتمہ کر دیتا۔ کیا اس کی ہی وجہ سے ہمارے خاندان پر یہ عذاب نہیں آیا؟ کیا اس نے ہی شہنشاہ کو نہیں ورغلایا؟''
ہچکولے کھاتی گاڑی میں نین دخت نے بیٹے کی سرزنش کی۔
''نہیں خسرو... تمھارے مہربان پدر کے اپنے دل میں خلقت کا درد تھا... اور پھر...'' اس نے یاد دلایا۔ ''موبدان اور وزرگان نے شہنشاہ کو معزول کرنے کا ارادہ تو بہت پہلے کر لیا تھا... یہ تو پیغمبر سے ملاقات سے بہت پہلے کی بات ہے۔''
خسرو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دوسرے دن علی الصبح شہر سے نکلنے والے تھے۔ خوزستان میں دریائے کارون کی خلیج میں ہند کے تجارتی جہاز لنگر ڈالتے تھے۔ ہوسکتا ہے وہ شہنشاہ کو ان جہازوں میں کسی ایک پر سوار کر کے ہند کی طرف نکل جائیں۔ نین دخت بھی یہی چاہتی تھی۔ وہ دور لے جانا چاہتی تھی اپنے شوہر اور اپنے پیارے بیٹے کو اس سرزمین سے جو آن کی آن میں دشمنوں سے بھر گئی تھی۔

۲۹

''تیرے ہاتھ اور پیر تو بہت گورے ہیں۔ ذرا چہرہ تو دکھا... ؟''

قلعے کے ایک پہریدار نے شوخی سے ایک دراز قد، بوسیدہ سیاہ چادر میں لپٹی عورت سے کہا جس نے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑا سا برتن تھام رکھا تھا۔ وہ قلعے سے کوڑا کرکٹ جمع کر کے لے جانے آئی تھی اور پاس کے دیہات میں رہتی تھی۔ اس شاہی کوڑے سے اسے گاؤں والوں کے کام کی بہت سی چیزیں مل جاتی تھیں۔ اس لیے گاؤں کی کوئی عورت گاہے گاہے یہاں آتی تھی۔

''تیرے منھ میں خاک۔'' عورت نے فراٹے سے دیہاتی بولی میں جواب دیا۔ ''ہٹ... میرا راستہ نہ روک...''

تیزی سے وہ محراب کے نیچے سے گزری اور ایوان میں داخل ہو گئی۔ ایوان کے دونوں طرف زرنگار مقفل دروازے تھے۔ نین دخت کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن سن سکتی تھی۔

''ایک... دو... تین... چار... '' دل پر قابو رکھنے کے لیے وہ دروازوں کا شمار کرتی ہوئی ایوان سے گزر رہی تھی۔ پانچواں دروازہ مقفل نہیں تھا۔ نین دخت نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ بے آواز کھل گیا۔ نین دخت نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

''شہنشاہ! اے میری آنکھوں کے نور... !'' اس نے ہولے سے کہا۔ قباد کمرے کی کھڑکی سے لگا دور تک پھیلے چٹیل میدان پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ نین دخت نے اپنی چادر اتار دی اور بانہیں کھولے قباد کی طرف بڑھی۔ قباد خوشی سے بے قابو ہو کر اس کی طرف لپکا۔ وہ ہم آغوش ہو گئے۔ نین دخت کے آنسوؤں نے قباد کی عبا کو بھگو دیا۔

''میں آپ کو یہاں سے نکال لے جانے آئی ہوں۔'' آخر اس نے کہا۔

''نکال لے جانے... مگر کیسے؟''

اب وہ بستر پر بیٹھ چکے تھے اور سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔

''آپ دیکھیے گا شہنشاہ... '' نین دخت نے کہا۔

''اور خسرو؟ وہ کہاں ہے۔''

''وہ پاس ایک گاؤں میں ہمارا منتظر ہے۔ فکر نہ کریں۔ اس نے بھیس بدل رکھا ہے۔ کیا ہم ہند کی طرف نکل چلیں گے شہنشاہ!'' نین دخت نے پیار سے قباد کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بات کرتی ہو!'' قباد نے اعتماد سے کہا۔''میں ہیبتالیوں کے پاس جاؤں گا، وہ میرے دوست ہیں۔ ہم اپنی سلطنت ان غداروں سے واپس لیں گے۔''

''مگر سیاوش...'' نین دخت نے کچھ کہنا چاہا۔

''سیاوش مجھ سے سب کچھ طے کر کے گیا ہے۔'' قباد نے کہا۔''میرا پیارا، وفادار دوست... وہ راستے میں اپنے فوجی دستوں کے ساتھ ہم سے آن ملے گا...''

نین دخت کو سیاوش نے ہی ایک وزیر کی خالی حویلی میں چھپایا تھا۔ باقی کا منصوبہ نین دخت نے خود تیار کیا تھا کیونکہ سیاوش پھر اس سے مل نہ سکا تھا۔

''ہمیں یہاں چند ساعتیں گزارنی ہیں۔'' نین دخت نے کہا۔

خواب گاہ میں وہ ایک دوسرے سے ہم آغوش بستر پر دراز ہو گئے۔

واپسی پر دیہاتی کوڑا اکٹھا کرنے والی عورت کے پاس ایک بڑی سی فرشی دری میں لپٹا ہوا کافی سامان تھا جسے وہ زمین پر گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھی۔

پہریداروں نے فوراً اسے گھیر لیا۔

''یہ کیا لیے جاتی ہو۔ ہم تمھاری تلاشی لیں گے۔''

''جناب افسران!'' عورت نے دیہاتی بولی میں کہا۔''صرف اتنا عرض کرنا چاہتی ہوں کہ اس ہفتے میں ناپاک ہوں۔ یہ میرے خون آلود ناپاک کپڑے ہیں جو میں اپنے گھر جا کر دھولوں گی۔''

ناپاکی کا لفظ سنتے ہی پہریدار چونک کر اس طرح پیچھے ہٹے جیسے کسی بچھو نے انھیں ڈنک مار دیا ہو۔ اب تو وہ اس کو یا اس کے پلندے کو کسی لاٹھی سے بھی چھونا نہیں چاہتے تھے۔ لپٹے ہوئے پلندے سے انھیں ایک عورت کے کپڑے باہر نکلے نظر آ سکتے تھے جن پر خون جم کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ نین دخت، دینگ کے آلودہ کپڑے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ وہ خود ان دنوں پاک تھی۔

''جا! جا!...'' پہریدار نے کہا۔

نین دخت پلندے کو گھسیٹتی ہوئی دور نکل گئی۔ لیکن پہریدار خوف زدہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے ناپاک کپڑے دیکھے تھے۔ جب ان کی چھ ماہ بعد گھر واپسی ہو گی اور پہرہ بدلا جائے گا تو انھیں اپنے موبدوں کو کفارہ دینا پڑے گا کہ یہ گناہ معاف ہو سکے۔

۳۰

قباد ہنوں کے خانات میں کروفر کے ساتھ پہنچا۔ سیاوش کے دس ہزار نفری پر مشتمل فوجی دستے اس کے جلو میں اور دائیں بائیں چل رہے تھے۔ تیز ہواؤں میں ان کے پرچم لہرا رہے تھے۔ یہ ایران شہر کے قدیم چمڑے کے درفشِ کاویانی کی کپڑوں پر نقل تھے۔ سرخ چوکھٹے میں اودے رنگ پر چار پھول کی پتیاں، اور ان کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کئی پتیوں کا پھول... یہ تھا اس لوہار کا پرچم جس نے ضحاک کو شکست دی تھی اور جس کی کہانی سب آریان صدیوں سے سنتے آ رہے تھے۔

ان کے استقبال کے لیے بڑھے آ رہے تھے سبک رفتار ہونان شہ سوار — بلند قامت، خوبصورت، ان کے پرچم ہواؤں میں اس طرح اڑ رہے تھے کہ پرچم پر بنا ہوا بیل پر سوار ان کا دیوتا شہ سواروں کے ساتھ دوڑتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

استقبالی دستوں کے پار حدِ نگاہ تک ہپھتالیوں کے خیموں کے جنگل کے جنگل اُگے تھے۔ ان میں ہی ایک وسیع ریشمی خیمے میں ہونان (ہپھتالی) کا سردار، خاقان ان کا منتظر تھا۔

قباد کے فوجی دستوں کو ہپھتالی فوجی دستوں نے اپنے خیموں میں سمیٹ لیا۔ قباد، نین دخت اور خسرو کے ساتھ خاقان کے خیمے میں لے جایا گیا۔

قباد اور خاقان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور یادوں کے ایک سیلاب نے دونوں کو آن لیا۔ قباد یہاں پہلی بار نہیں آیا تھا۔ ابھی جب وہ سات آٹھ برس کا بچہ ہی تھا، تب خاقان اسے یرغمال بنا کر اپنے خانات میں لے آیا تھا۔ ہپھتالی ساسانیوں پر حملے کرتے رہتے تھے اور قباد کے باپ پیروز نے ہپھتالیوں سے جنگ کی تھی۔ اس جنگ میں پیروز ہار گیا تھا۔ خاقان نے پیروز سے جنگ کا ہرجانہ طلب کیا تھا لیکن ساسانی خزانہ خالی تھا۔ خاقان پیروز کے محبوب بیٹے کو یرغمال بنا کر لے آیا تھا۔ خاقان اور اس کی بیگم کے خیموں میں قباد نے لڑکپن کے تین برس گزارے تھے۔ وہ ہپھتالی شہ سواروں کے سبک رفتار اور شاندار گھوڑوں پر سوار ہوا تھا اور خاقان کی بیگم نے اسے بسا اوقات اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا تھا۔ ان تین برسوں میں ان کے درمیان ایک اُنس، ایک محبت، ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ تین برس بعد جب شہنشاہ پیروز ہرجانے کی ساری رقم ادا کر سکا اور خاقان، قباد کو واپس بھیجنے پر مجبور ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خاقان اور اس کی بیگم کی اس وقت

تک کوئی اولاد نہ تھی۔

''بوڑھے ہو گئے ہیں خاقان...'' قباد سوچ رہا تھا۔ اسے جوان سال خاقان یاد آ رہا تھا جو نیزہ لہراتا ہوا گھوڑے کو اتنا تیز دوڑاتا تھا کہ گھوڑے کے منہ سے کف جاری ہو جاتا تھا۔

''وہ چھوٹا سا، دبلا پتلا قباد... کیا شاندار جوان نکلا ہے۔'' خاقان سوچ رہا تھا۔ آخر وہ مسکرا دیا۔

''یہاں آؤ... میرے پاس بیٹھو۔'' خاقان نے کہا۔

قباد نے خم ہوکر اس کی قدم بوسی کی۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ سلطنتِ ساسانیہ کا حکمران ہے۔ شہنشاہ! جسے درباری ''مالک ہر دو جہان'' کہتے تھے۔ اس لمحے اسے صرف وہ باپ کی سی شفقت یاد تھی جو خاقان نے ایک ایسے بچے پر نچھاور کی تھی جو سراسر اس کے رحم وکرم پر تھا۔

خاقان نے اسے گلے لگا لیا۔ قباد ادب سے اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

''میں نے سنا ہے، ساسانی موبدوں اور وزرگان نے تمھارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ وہ سدا کے احمق ہیں۔'' خاقان نے ہپھتالی بولی میں کہا۔

قباد کے ذہن میں سرسراہٹ سی ہو رہی تھی۔ برسوں سے بھولی ہوئی ہپھتالی بولی جیسے لفظ لفظ اس کی زبان پر واپس آ رہی ہو۔ اس نے اٹک اٹک کر بولنا شروع کیا۔

''جی ہاں، عالی جاہ! لیکن میں اپنی سلطنت ان سے واپس لوں گا۔''

خاقان کے خدام نے فرش پر بچھے قیمتی قالین پر دسترخوان بچھا دیا۔ قابوں کے سرپوش ہٹائے گئے تو خوشبودار دھویں کے مرغولے خیمے میں پھیل گئے۔

''میں اپنی شہزادی کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہوں۔'' کھانا کھاتے ہوئے خاقان نے محبت سے کہا۔

''شہزادی!'' قباد نے حیران ہوکر پوچھا۔ پھر اسے یاد آیا۔ خاقان نے جنگ کو دوستی میں بدلنے کے لیے پیروز کی بیٹی سے شادی کی خواہش کی تھی۔ لیکن پیروز محلوں میں ناز و نعم سے پلی شہزادی کو خانہ بدوشی کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ایک حسین کنیز کو قیمتی نذرانوں کے ساتھ خانات بھیج دیا تھا اور اسے یہ پیغام بھیجا تھا کہ یہی میری بیٹی ہے۔ کنیز بہت خوبصورت اور خوش اطوار تھی اور خاقان اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ شہزادی نہیں ہے۔ گو بعد میں یہ اطلاع اس تک پہنچ چکی تھی کہ اس کے ساتھ پیروز نے دھوکا کیا ہے، لیکن اوّل تو اسے اس خوش اندام حسینہ سے لگاؤ ہو گیا تھا، اور دوسرے تب تک وہ ایک ننھی بچّی کی ماں بن چکی تھی جو خاقان کی واحد اولاد تھی۔ ہپھتالی

باپ (جسے ساسانی کثرتِ استعمال سے ہپھتالی اور پھر، ابدالی کہنے لگے تھے،) اور صوبہ فارس کی ماں کے بطن نے جنم دیا تھا۔ اس نطفے کو جواب دراز قد، مضبوط کاٹھی، دودھ و گلاب سی رنگت اور ترشے ہوئے خدوخال کی حسینہ تھی۔

''کیا شہزادی معظمہ ابھی ناکتخدا ہیں؟'' قباد نے تجسس سے پوچھا۔

''نہیں...!'' خاقان نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہمارا ایک سالار اس کا شوہر ہے۔لیکن وہ تم کو فوقیت دے گی۔تم اطمینان رکھو...''

''اوہ!'' قباد نے کہا... ''اس کو یاد آیا کہ ابدالیوں میں عورتیں متعدد شوہر رکھ سکتی تھیں۔ بالکل جس طرح مملکتِ ساسان میں مرد کئی بیویوں کے مالک ہو سکتے تھے۔''

''اپنا اپنا رواج ہے۔'' قباد نے سوچا۔

''یہ میرے لیے بہت باعثِ عزت ہوگا۔'' میری خوش نصیبی ہے جنابِ عالی کہ آپ کی دامادی کا شرف حاصل کروں۔''

قباد نے ادب سے جواب دیا۔

اس رات اپنے خیمے میں قباد نے نین دخت کو یہ سارا ماجرا سنایا تو ملکہ کا دل ڈوب گیا۔ اس سے شادی کے بعد قباد نے دوسری کسی عورت پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اس نے تو حیرہ سے بھیجی ہوئی نہایت حسین کنیز کو بھی اپنے کسی بیٹے کو بخش دینے کا فیصلہ کیا تھا۔غم و غصّے سے نین دخت رونے لگی۔ وہ خاقان کی بیٹی کو زہر دے دے گی۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا۔

''روؤ مت میری جان!'' قباد نے اسے سمجھایا۔''مجھے ابدالیوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ نہایت جیالے اور جنگجو شہسوار اور پیادے مجھے میری سلطنت واپس دلا سکتے ہیں۔ اور پھر... تمھاری جگہ تو میرے دل میں ہے۔ خاقانی شہزادی سیرا تو یوں بھی زیادہ وقت اپنے پہلے شوہر کے ساتھ گزارے گی۔''

''کیا؟'' نین دخت نے حیرت سے پوچھا۔

''ابدالی عورتوں کے کئی شوہر ہوتے ہیں۔'' قباد نے اسے بتایا۔

نین دخت حیرت سے قباد کی باتیں سنتی رہی۔ ''کیا واقعی؟'' اس نے پوچھا۔

یہ دنیا کتنی رنگ برنگی تھی، اور وہ اس کے بارے میں کتنا کم جانتی تھی۔ قباد اسے بتا رہا تھا کہ عورتوں کے کئی شوہر ان کے باپ اور بعد میں شوہر کی مرضی سے منتخب ہوتے ہیں۔ اولاد بہرحال پہلے شوہر کی ہی مانی جاتی ہے۔

''اولاد... !'' نین دخت کو اچانک خسرو کا خیال آیا جو اپنے علیحدہ کمرے میں محوِ خواب ہو گا۔
''تم اس خاقانی عورت کے ساتھ ہم بستری نہ کرنا... '' اس نے آنسو بھری آواز میں کہا۔
قباد ہنسنے لگا۔
''اچھا... یہ وعدہ رہا۔''
لیکن نین دخت کے دل پر اب کسی وعدے کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ قباد ایسا نہیں کر سکے گا۔ اب وہ صرف خسرو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کی زندگی کا حاصل اس کا بیٹا ہی تھا۔ وہ اسے اس منحوس خانات سے کہیں دور، کسی محفوظ مقام پر بھیج دینا چاہتی تھی۔ اس کا بیٹا! اس کا خسرو! بے دھیانی سے اس نے کہا:
''کیوں کر لیتی ہیں یہ عورتیں کئی شادیاں... صرف باپ یا شوہر کے کہنے پر...''
''کیوں؟'' قباد نے دُہرایا... ''عورتیں بے چاری کر ہی کیا سکتی ہیں۔''
ہولے ہولے سسکیاں لیتی نین دخت نیند کے سیال میں ڈوبنے لگی۔ تب ہی کسی خواب کی طرح ایک خیال نے اسے چونکایا۔ اچانک اس نے قباد کی سمت چہرہ پھیر کر کہا:
''کیا کر سکتی ہیں عورتیں؟ اور میں نے ابھی تم کو قید سے رہائی دلائی... میں نے!''
قباد یہ سن کر لمحہ بھر کو حیران ہوا۔ پھر اس نے کہا:
''وہ تو اس لیے کہ... تم میری جان جو ہو۔ اب سو جاؤ۔ میری زنِ پادشائی۔ وہ تم ہو اور تم ہی رہو گی۔''

قباد اپنے جواب سے مطمئن تھا۔ اسے عادت تھی عورتوں کو کسی کام کا نہ سمجھنے کی اور وقتِ ضرورت ان سے ہر کام کروانے کی۔ ان دو خیالات کے تضاد پر کوئی غور نہیں کرتا تھا۔ پیغمبر مزدک نے عورتوں کو سب لوگوں میں برابر تقسیم کرنے کا مزدائی پیغام سنا دیا تھا۔ اب غریب سے غریب کسان کی بھی ایک بیوی ہو سکتی تھی۔ متعدد بیویاں اب کسی کے لیے جائز نہیں رہی تھیں۔ لیکن یہ شادی وہ ایک مجبوری اور ضرورت کے تحت کر رہا ہے۔ پیغمبر مزدک اس بات کو ضرور سمجھ جائے گا۔ دینِ درست کے مطابق تو یہ گناہ ہو گا، لیکن گناہ کا تو کفارہ موبدان کو دیا جا سکتا تھا۔ گو وہ پرانے دین کے تحت تھا لیکن یہ تھا کتنا کارآمد رواج! افسوس کہ وہ رخصت ہوا۔ قباد سوچ رہا تھا۔ یہ تو دوبارہ داخلِ دین کرنا چاہیے! وہ جانتا تھا، اور ہر شخص ہی جانتا تھا کہ کرتا تو انسان وہی ہے جس کی ضرورت پڑے یا جس سے وہ خوش ہو۔ اگر وہ گناہ ہو تو کفارہ اسی لیے بنا ہے۔ کتنی اچھی چیز ہے یہ بھی۔ انسان کو احساسِ جرم سے آزاد کر دیتی ہے۔

قباد مطمئن ہو کر سو گیا۔ اس کے دل و دماغ کا ایک حصّہ اب نئی شادی کا منتظر تھا۔

دوسری صبح نین دخت نے خسرو کو سیاوش کے ہمراہ روانہ کر دیا۔

''تمھارے شہنشاہ خاقان کی بیٹی سے شادی کرنے والے ہیں۔ تم اپنے ولیٔ عہد کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دو۔ اس کی جان کو یہاں خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''سیاوش! معلوم کر کے مجھے اطلاع پہنچانا کہ پیغمبر مزدک کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔''

سیاوش کو اپنا دوست یاد آیا۔ مملکت کے سر کے تاج کو بہ حفاظت دشمنوں کے نرغے سے نکالنے کے بعد اب اسے اپنا گھر، اپنا وطن اور اپنا دوست یاد آ رہا تھا۔ وہ فکرمندی سے سوچ رہا تھا، مزدک کہاں ہو گا؟

مزدک طیسیفون میں ہی تھا۔

طیسیفون کی شاہراہوں اور گلی کوچوں میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ گاؤں سے آنے والے کسانوں کا ہجوم جن میں شہر کے حرفت کار بھی شامل ہو گئے تھے، پیغمبر کی حویلی کی طرف رواں تھے۔ جاماسپ کے فوجی دستے انھیں روکنے کی کوشش میں ناکام رہتے تھے۔ ہجوم نے مزدک کی حویلی کو اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا تھا۔

''یہ اعلان کر دیا جائے... '' موبدانِ موبد نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، وزرگان سے کہا۔ ''کہ ہم مزدک کو کچھ نہ کہیں گے۔ اسے ضرر نہیں پہنچائیں گے... تب شاید ان نکمے کرشانوں سے ہمارا پیچھا چھوٹے اور یہ واپس جا کر کاشت کاری کریں۔''

''یہ بہت ضروری ہے۔'' ایک امیر تاجر نے جاماسپ کے سامنے عرض گزاری۔ ''ورنہ حضور ہم پھر کھائیں گے کیا؟''

فرمان جاماسپ کے سامنے محض رسماً لایا گیا۔ اس نے بخوشی چمڑے کے کاغذ پر دستخط کر دیے۔ طیسیفون میں جو کچھ ہو رہا تھا، کم عمر شہنشاہ کی سمجھ سے بعید تھا۔ وہ جب دربار لگاتا تو ہر مجرم کو معاف کرنے لگا تھا۔ وزرگان کے لیے اسے سمجھانے کی کوشش بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ گشتاسپ خزانے کا بڑا حصّہ اپنی حویلیوں میں پہنچوا چکا تھا۔ لیکن افواج کے افسران کو تنخواہ تو دینی تھی۔ اسے وزرگان اور امراء کو مجبور کرنا پڑا کہ وہ افواج کی تنخواہ کے لیے رقم مہیا کریں۔ اس پر امراء ناراض ہونے لگے۔ افواج میں سیاوش کا دستہ غائب تھا جو دلیری اور فنِ جنگجوئی میں طاق تھا۔ بقیہ افواج محاذہ میں یہودی باغیوں سے جنگ کر رہی تھیں۔

جیسے یہ سب وزرگان کے لیے کافی دردِ سر نہ ہو، ان کی سلطنت کے اہم حصّے آرمنیا کے حاکم

نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ساسانی افواج کا ایک حصّہ سرعت سے آرمنیا کی جانب پیش قدمی کرنے لگا۔

''عالم پناہ! ان باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

''انھیں معاف کر دیا جائے۔'' جاماسپ نے بے پروائی سے کہا۔

''عالم پناہ... کسان اور حرفت کار وزرگان کی حویلیوں میں گھس کر اسباب اٹھا لے جا رہے ہیں۔''

''واقعی؟'' شہنشاہ نے تعجب سے پوچھا... ''کیا اب بھی وہ ایسا کر رہے ہیں؟''

گشتاسپ افسوس اور پچھتاوے سے شہنشاہ کے سامنے مودب کھڑا رہا۔ اگر کسی صورت وہ شاہی نسب حاصل کر سکتا تو مملکت کو خود سنبھال لیتا۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ بہرحال، اس نے سوچا، رات کے اندھیرے میں ایک سپہ سالار کو قتل کر دینا اور مملکتِ ساسانیہ کا انتظام کرنا یکساں بات نہ تھی۔ اگر کرشان اور حرفت کار کسی ایک شخص کے احکامات بجالاتے تو اسے ختم کرایا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مزدک کی حفاظت کرتے ہیں۔ دن اور رات ان کے لیے برابر ہیں۔ وہ رات بھر چھوٹے چھوٹے الاؤ جلا کر اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے رہتے ہیں اور دیہاتی نغمے گاتے ہیں۔

''قباد!'' گشتاسپ سوچ رہا تھا۔

کیا بمشکل قباد کو معزول کرنے اور اسے قلعۂ فراموشی کے سپرد کرنے والے گشتاسپ کو قباد یاد آ رہا تھا؟ قلعۂ فراموشی میں تو اس نے بہت کم دن گزارے۔ وہ فرار ہو گیا تھا اور ہونان کے خانات جا پہنچا تھا۔ کیا وہ ہونان کی افواج کے ساتھ حملہ آور ہو گا؟

گشتاسپ متفکر تھا۔

۳۱

غسلِ پاکی سے فراغت کے بعد جب دینگ کی کنیزیں اسے اس کی خواب گاہ میں لائیں تو دینگ نے اس لباس پر نظر ڈالی جو نین دخت اس کے کمرۂ ناپاکی میں چھوڑ گئی تھی۔

وہ سپید نہایت باریک دیبا کی دراز قبا تھی، جس کے کناروں پر گلے اور بازوؤں پر نقرئی اور طلائی دھاگوں سے بیل بوٹیاں بنی تھیں۔ لباس پر سچے سفید موتیوں کا کام تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک نازک سپید کلاہ تھی جس میں کسی زرد پرندے کے چھوٹے سے نرم پر کی کلغی لگی تھی۔

''یہ لباس مجھے پہنا دو!'' دینگ نے اپنی کنیز سے کہا۔ اس نے آہنی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کے سیاہ گھونگھریالے بالوں پر سفید کلاہ بج رہی تھی۔ کنیزیں اس کے چہرے پر غازے کی ہلکی سی تہہ جما کر اس کے ابروؤں کو چننے لگیں۔ پھر انھوں نے دینگ کے جسم کو موسمِ بہار کے تازہ پھولوں کے عطر میں بسا دیا۔

رات کو گھر واپس آ کر پیغمبر حسبِ معمول رات کا کھانا ایک سینی میں سجا کر اپنی عورت کے لیے لایا تو وہ دروازے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سینی کو ایک تپائی پر رکھ کر اس نے آنکھیں ملیں۔ جو وہ دیکھ رہا تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ دینگ کے بستر میں دیوار کی طرف کروٹ لیے نین دخت خوابیدہ تھی۔

نین دخت!

ملکہ ساسانیہ... وہ جو اہورامزدا کی تخلیق کردہ خوشی تھی۔ دینگ نے کروٹ بدلی۔ ''اوہ!'' پیغمبر نے سانس بھری۔ یہ دینگ تھی۔ مگر کیا یہی دینگ تھی؟ اتنی حسین!! تعجب اور افسوس سے اس کا دل بھر آیا۔ اس نے دینگ کو اٹھا کر بٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے اور نین دخت کے لباس کو چھوا۔

نین دخت نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اس نے پیغمبر کو اپنی طرف کھینچا۔

مزدک ملکہ کی قبا کی ریشمی زرتار نرم تہوں میں اترتا چلا گیا۔ ایک ملکوتی خوشبو نے انھیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ یہ اس طرح تھا جیسے وہ ایک بہت بڑے بحری جہاز کے عرشے پر لوہے کی جالی تھامے کھڑا تھا اور جہاز ایک اونچی لہر پر سوار اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ نیلا آسمان لمحہ لمحہ اس کے نزدیک آ رہا تھا۔

حویلی کی چھت پر اور باہر زور سے پانی گرنے لگا۔ طیسیفون میں بارش ہو رہی تھی۔ بارش! آخر کار! کہیں زور سے بجلی چمکی اور خواب گاہ، روشن ہو گئی۔ پھر بادلوں میں دھما کا ہوا۔ دینگ نے پیغمبر کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ ''اس ہم بستری سے ایک بہت خوبصورت بچہ جنم لے گا۔'' اس نے سوچا۔ اور وہ پیغمبر نہیں ہوگا۔ میرے پاس رہے گا۔

حویلی کے باہر آدھے سوئے، آدھے جاگے کسان اور حرفت کار پوری طرح بیدار ہوکر خوشی سے چیخ رہے تھے۔ وہ بارش میں بھیگتے ہوئے ناچنے لگے۔ وہ گیت گا رہے تھے اور بارش کا جشن منا رہے تھے۔ پانی نے الاؤ بجھا دیے تھے لیکن ایک الاؤ کو کسانوں نے بجھنے نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی جلتی لکڑیاں حویلی کے برآمدے میں لے آئے تھے۔ انھوں نے اس کے گرد پتھروں کا حصار بنا دیا تھا۔

آسمان پر بہت ہی پاس بجلی پھر کڑکی... آسمان جیسے دولخت ہو گیا ہو۔ تیز گلابی دھاریوں نے سیاہی کو چیر ڈالا۔ بادلوں میں دھماکے ہوئے اور پانی زور شور سے پھر برسنے لگا۔ برزین اپنے ریشم باف چینی دوست کے ساتھ ایک پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ جسم پر بارش کے لمس نے چینی کے ذہن میں ایک فرحت پذیر ہم بستری کا خواب جگا دیا تھا۔ اسی تصوّر میں مست اس کے دوست شوان نے برزین کے کان میں کہا:

''پہلے تین، پھر دو... پھر اکٹھے چھ بار... دخول...''

شوان کو دجلہ کے پار حویلی میں تازہ وارد رئیس کی نرم و نازک حسین بیوی یاد آ رہی تھی۔ شاید اس بار وہ اسے پکڑ کر لا سکے۔

برزین نے بہت مسرور حیرت سے پوچھا:

''اے میرے یار... کیا تم اس وقت بھی گنتی کر سکتے ہو؟''

''عادت کی بات ہے...'' ترچھی آنکھوں اور ہاتھی دانت کی سی رنگت کے جواں سال خطائی نے عقلمندی سے سر ہلایا۔ برزین اس امکان پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور زانو پر ہاتھ مارا۔ اس کے بلند قہقہے بارش کی آواز میں گھل مل گئے۔ اس بات پر برزین ساری رات ہنستا رہا۔ بلاشبہ اس کا دوست ہندسوں کا عاشق ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ ریشم بنتے ہوئے بھی فرش پر ایک چھوٹی سی لکڑی سے حساب کتاب لکھتا رہتا تھا۔

دینگ کے بستر میں چت لیٹا بامداد کا بیٹا تاریکی میں مسکرا رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے سر کے نیچے تھا اور ایک بانہہ سے اس نے دینگ کو لپٹا رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کا بازو سہلا رہا تھا۔

کمرے کے دریچے سے برستا ہوا آسمان نظر آ رہا تھا۔

''اور اہورامزدا نے سب سے پہلے آسمان بنایا۔ پھر اس نے پانی بنایا... اور پانی ہم سب میں رہتا ہے۔ وہ درختوں میں نمی ہے، اور یہ پانی جو برس رہا ہے اس نمی کو پھر درختوں کو دے رہا ہے۔ اس میں حرارت ہے... آگ... جو مقدس ہے اور جس کی نمی سے دوستی ہے۔''

پیغمبر دھیرے دھیرے زیرِ لب اَوستا کی سطریں پڑھ رہا تھا۔ اس نے کیوں برسوں خود کو خوشی سے محروم رکھا؟ اس نے دوسروں کو زندگی سے بھرپور لطف لینے کا سبق دیا اور خود کو ہی یہ بتانا بھول گیا؟ افسوس! لیکن افسوس سے کیا حاصل۔ وہ زندہ تھا، اور اب اس کی گھر پر گزاری ہوئی ہر شب دینگ کے پہلو ہی میں بسر ہوگی۔

اور پھر مقدس اہورامزدا نے مٹی کو تخلیق کیا... پھر اس نے ہرے بھرے پودے بنائے پھر جانور... اور پھر انسان... اور جو کچھ اس نے بنایا وہ یکساں سب انسانوں کے لیے تھا...''

پیغمبر نے نسک پڑھ کر دینگ کے منہ پر پھونکا۔ دینگ نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ہنس پڑی۔

۳۲

شہنشاہِ روم، فلاویئس پطرس سباتیئس جسٹینین افسردہ اور پریشان تھا۔ وہ اپنے ساسانی مہمانوں سے ملاقات کا وقت نہیں نکال سکتا تھا جو ایک فوجی سالار اور ایک کم سن شہزادے پر مشتمل تھے۔ سالار نے اپنا نام سیاوش بتایا تھا۔ شہزادہ معزول شہنشاہ قباد کا فرزند تھا۔ سیاوش نے اسے تجویز بھیجی تھی کہ جسٹینین شہزادہ خسرو کو اپنا متبنیٰ کرے اور اپنے پاس رکھ لے۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ ماضی میں ایک رومی شہنشاہ قیصر آرکیڈیوس کے بیٹے تھیوڈوسیوس کو ساسانی بادشاہ یزدگرد اوّل نے متبنیٰ کیا تھا اور اس کا اتالیق بن گیا تھا۔ جنگوں کے درمیان اپنے فرزندوں کی حفاظت کرنے کے لیے رومیوں اور ساسانیوں کو ایک دوسرے سے بہتر کون مل سکتا تھا؟ ان کی حمایت سے یہ شہزادے مملکت کے تخت پر بھی بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔

اور اب جب کہ سلطنتِ ساسانیہ ایک کم عقل جوان کے قبضے میں تھی اور یہ اس سلطنت پر حملہ کرنے کا بہترین موقع تھا، معزول بادشاہ نے اپنے بیٹے کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ بادشاہ تو معزول تھا لیکن شہزادے کا نسب کل اسے سلطنتِ ساسانیہ کا وارث بنا سکتا تھا۔ اس لیے جسٹینین مخمصے میں گرفتار تھا۔ وہ اپنے سپہ سالار سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا جو ہسپانیہ پر دوبارہ رومی اقتدار قائم کرنے کے لیے ہسپانیہ کی سرحدوں کی سمت جا چکا تھا۔ سلطنتِ روم کا یہ حصّہ کئی عشروں سے گوتھ نامی قبائل کے قبضے میں تھا۔ اس کی بازیابی بھی بہت ضروری تھی۔ لیکن ان سب سے زیادہ پریشان کن وہ انتشار تھا جو عالمِ عیسائیت میں پھیل رہا تھا۔ ایک سنگین اختلافِ رائے جو یسوع مسیح کی ذات کے بارے میں معمولی قیاس آرائی سے شروع ہوا تھا۔ سلطنت میں یک جہتی قائم رکھنے کے لیے اس اختلاف کو ختم کرنا ضروری تھا۔

قیصر جسٹینین نے ساسانی مہمانوں کو دربار میں بلا لیا۔ لیکن وہ شامی اور پایۂ تخت کے مذہبی رہنماؤں کے نمائندوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اس نے سیاوش تک یہ پیغام پہنچایا کہ وہ اس گفتگو کے اختتام کا انتظار کریں۔

سیاوش نوجوان شہزادے کے ساتھ دیوانِ خاص کی ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ گیا۔

ایک دراز ریش نورانی صورت کا بزرگ پادری جو شام سے آیا تھا، یونانی زبان میں یہ

عرض گزار رہا تھا:

''شہنشاہِ معظم، باپ، بیٹا اور روح القدس، تین الگ الگ شخصیتیں تو نہیں ہو سکتیں۔ یقیناً یہ مصلوب مسیح میں یکجا تھیں۔''

''مسیح خود خدا تھے۔''

''تو کیا وہ انسان نہیں تھے۔'' قسطنطنیہ کی مجلسِ علماء کے نمائندے نے طنزیہ کہا۔

''وہ انسان تھے اور ساتھ ہی خدا بھی تھے۔ ان میں دونوں پہلو یکجا تھے۔'' شامی نمائندے نے کہا۔ ''اگر یہ الگ الگ تھے تو گویا باپ کو بیٹے پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ یسوع مسیح پر کسی کو بھی کیونکر فوقیت ہو سکتی ہے۔ وہ خود خدا تھے۔''

''لیکن حضورِ والا...'' قسطنطنیہ کی مذہبی مجلسِ عاملہ نے اب براہِ راست قیصر سے مخاطب ہو کر کہا: ''نئے عہدنامے میں، پاک مسیح کے حواریوں، خصوصاً متّی نے صاف الفاظ میں لکھا ہے۔ یسوع نے فرمایا، جو میرے باپ نے کہا میں وہ ہی تمھیں بتا رہا ہوں۔ جناب والا غور کیجیے، جو باپ تھا وہ پاک مسیح نہیں تھا، اور جو پاک مسیح تھے وہ روح القدس نہیں ہے۔ لہٰذا یہ تین ہوئے۔ مکمل خدائے پاک ایک تثلیث ہے۔''

شامی معلم دین نے اپنی عصا زمین پر پٹکی اور دفع بلیّات کے لیے اپنی انگلی سے چہار اطراف صلیب کا نشان بنا کر کہا:

''تو پھر مصلوب کون ہوا؟ کیا باپ اور روح القدس مصلوب نہیں ہوئے؟''

''مصلوب پاک مسیح ہوئے۔ تم ایسی تفصیلات میں جا رہے ہو جو تمھیں کفر کی جانب لے جائیں گی۔ باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث ہی مکمل خدائے ربانی ہے۔''

شامی معلم دین نے کہا:

''اس طرح ایک نہیں بلکہ تین خدا ہو جاتے ہیں۔ دینِ موسوی میں جس خدا کی تلقین ہے وہ واحد تھا۔ پرانے عہدنامے میں صاف لکھا ہے۔ اور کیا وہ ہم اب تک نہیں پڑھتے؟''

قسطنطنیہ کے معلم دین کو اب غصّہ آ رہا تھا۔ ''پرانے عہدنامے میں جو کچھ بھی لکھا ہو، تم شامی کہنے کو عیسائی ہو گئے ہو لیکن رہے وہی یہودی کے یہودی...''

''اے خدائے پاک، ہمارے باپ، ہماری مدد کر!'' شامی معلّمِ دین نے نظریں دربار کی چھت پر گاڑ کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ''آپ ایک راسخ مسیحی کو یہودی بتا رہے ہیں جبکہ یہودی ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔''

قیصر جسٹینین کہنی کو اپنی کرسی کے ہتھے پر ٹکائے ہاتھ سے آہستہ آہستہ اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

سیاوش یونانی زبان سے بخوبی واقف تھا۔ یہ ساری بحث وہ کوشش سے مسکراہٹ دبائے ہوئے سن رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خود طیسیفون میں مسیحیوں کے فرقے اس موضوع پر دست و گریباں ہوتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ساسانی سپاہ کو ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرانا پڑتا ہے۔

قیصر جسٹینین چند لمحے تک ہونٹ چباتا رہا۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس بحث میں نہ الجھتا لیکن وہ اپنی ذمے داری سے بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عظیم اور مقدس مذہبِ عیسوی میں وحدت و تثلیث کا مسئلہ اسے ہی حل کرنا پڑے گا۔ اہم بات یہ تھی کہ قسطنطنیہ کی مذہبی مجلسِ عاملہ جو سلطنتِ رومیہ کے ایک قیصر نے بنائی تھی، کل عالم عیسائیت میں نہایت عزت و احترام سے دیکھی جاتی تھی۔ دور دراز سے آنے والے نقرئی اور طلائی نذرانوں کو جمع کرتے کرتے اب ان کا خزانہ خود قیصرِ روم کے برابر ہو چکا تھا۔ وقتِ ضرورت پر وہ ہی شہنشاہ کو کم شرح سود پر قرض دیتے تھے۔ آخر اس نے اپنا عصا اٹھایا اور شامی معلمانِ دین سے سختی سے کہا:

''میں تمھاری توضیحات کو غلط سمجھ رہا ہوں۔ تم دین میں تفرقہ پردازی نہ کرو۔ مقدس صحیفے لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں اور تم میں سے بیشتر انھیں ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

دربار کے پہریدار شامی معلمانِ دین کو دربار سے باہر لے گئے۔ جاتے ہوئے وہ چپکے چپکے بڑبڑا رہے تھے اور ان کے تیور سے عیاں تھا کہ وہ اپنے موقف سے ہٹنے والے نہیں تھے۔

اب جسٹینین لاطینی میں قسطنطنیہ کی مذہبی مجلسِ عاملہ کے اراکین سے مخاطب ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ قسطنطنیہ میں اب اکا دکا شخص ہی لاطینی پر عبور رکھتا تھا۔ سلطنتِ یونانی رنگ میں اتنی شرابور ہو چکی تھی کہ لاطینی ماضی کی یادگار بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن وہ لاطینی سے واقف تھا اور اس کو اس بات پر بہت فخر تھا۔ اپنے علم کو معلمانِ مذہب تک پہنچانے کا موزوں ترین موقع دیکھ کر وہ اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

''شاید اس مسئلے کو بزورِ شمشیر دبانا پڑے گا۔ لیکن یہ لوگ بیشتر سلطنتِ روم سے باہر رہتے ہیں۔ ہم ان کے خیالات کی اپنی سلطنت میں ہرگز اشاعت نہیں ہونے دیں گے۔ آپ مطمئن رہیں۔''

قسطنطنیہ کے معلموں نے مشکور تبسم سے قیصرِ روم کی طرف دیکھا۔

''اب ہم اجازت چاہیں گے۔'' انھوں نے کہا:

قیصر جسٹینین نے سر کو جنبش دی۔ پھر رخصت ہوتے ہوئے معلمان سے کہا:

''اور ذرا لاطینی زبان پر عبور رکھنے والے کسی عالم کو دفترِ قوانین رومیہ بھی بھجوائیے۔ میں تمام رومی قوانین کورپس جیورس سوی لس کے نام سے لاطینی میں مرتب کر کے لکھوانا چاہتا ہوں۔ قانونِ رومیہ کی رو سے سلطنت کا سرکاری مذہب تثلیثی مسیحیت ہی ہوگا اور صرف مسیحیوں کو شہریت دی جائے گی۔''

قسطنطینی معلمین کے چہرے مسرت سے چمکنے لگے۔

''بہت خوب!'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''اس طرح بدبخت نسطوریوں سے بھی چھٹکارا نصیب ہوگا!''

قیصر جسٹینین نے ساسانی مہمانوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جن کے کاتب، اس نے سنا تھا، دن رات قوانین نویسی کرتے رہتے ہیں۔

معلمین کا گروہ رخصت ہونے لگا۔ اچانک قیصر کو پرانے عہدنامے کا خیال آیا۔ اس کی تعلیم ختم تو نہیں کی جاسکتی۔ اس نے کہا:

''جی ہاں، ایک بات اور... ذرا مقدس صحیفے پرانے عہدنامے پر ایک نظر تو ڈالیے اور دیکھیں اس میں کہاں چھوٹی موٹی ترامیم کی جاسکتی ہیں، کہ یہ مسیحیوں کے قابل بن سکے۔''

''یہودی واویلا کریں گے۔'' ایک معلم نے مسکرا کر کہا۔

''ہم انھیں اس قابل نہیں چھوڑیں گے۔'' جسٹینین نے جواب دیا۔

مذہبی معلمین کی رخصت کے بعد، ایک لمبی سانس لے کر جسٹینین نے ساسانی مہمانوں سے رجوع کیا۔

''قسطنطنیہ میں خوش آمدید!'' اس نے دونوں بانہیں پھیلا کر کہا۔

''مجھے آپ کا پیغام مل گیا۔ میں کہنا چاہتا ہوں افسر، گو ساسانیوں سے ہمارا کوئی امن معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں آپ کو مایوس نہیں لوٹانا چاہتا۔ کل صبح، ہتھیار ایک دوسرے سے بدل کر میں معزول شہزادے کو اپنی پناہ میں لے لوں گا لیکن...'' اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اس پر کوئی تحریری معاہدہ کرنے سے فی الوقت معذور ہوں۔''

سیاوش سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا:

''چلیے فی الوقت اتنا ہی کافی ہے۔ شہزادہ، جو ہمارا ولی عہد ہے، یہاں محفوظ تو رہ سکے گا۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' قیصر نے کہا۔ ''وہ بالکل محفوظ رہے گا اور ہم اس کا پورا پورا خیال

بھی رکھیں گے۔ یہاں وہ ایک رومی امیر زادے کی پُرآسائش زندگی گزارے گا۔ اب آپ لوگ آرام کریں۔''

جسٹینین نے سر کو جنبش دی جو ملاقات ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ پہریدار آریانی مہمانوں کو شاہی مہمان خانے کی خواب گاہ تک لے چلے۔ سیاوش راہداریوں میں بچھے قالینوں کو دیکھ کر چپکے سے مسکراتا رہا جو شیرازی قالینوں کی کامیاب نقل تھے۔

شاہی خواب گاہ میں دو بستر مہمانوں کے منتظر تھے۔ سونے سے پہلے شہزادہ خسرو نے سیاوش سے پوچھا:

''کیا رومی آئندہ بھی ہماری سلطنت پر حملہ کریں گے؟''

''کون کہہ سکتا ہے!'' سیاوش نے لمبی سانس بھری۔ ''فی الحال تو رومی افواج سلطنتِ رومیہ کی مغربی سرحدوں پر مصروف ہیں۔ قیصر رومی سلطنت کے ان تمام علاقوں کو واپس لینا چاہتا ہے جن پر مغرب کے جنگجو قبیلوں نے قبضہ کر لیا ہے۔''

خسرو کا دل قیصر کے لیے تعریفی جذبات سے بھر گیا۔ اسے قیصرِ روم پسند آیا تھا۔ ایک شہنشاہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ جسٹینین تھا۔

''کیا قیصر نسبی لحاظ سے شہنشاہ ہے؟'' خسرو نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''نہیں تو...'' سیاوش نے کہا۔ ''اس کا چچا ایک فوجی سالار تھا۔ وہ قیصر بن گیا تھا۔ اسی نے جسٹینین کو قیصر نامزد کیا۔ اس سے پہلے ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں تھا۔''

''اچھا؟'' خسرو نے کچھ مایوسی سے کہا۔ اسے آریانوں کی اقدار عزیز تھیں۔ نسب اور جائیداد! سلطنت کی شان و شوکت کی یہی بنیادیں ہونی چاہییں۔ اس نے سوچا۔ ان سے ہی شہنشاہیت خلقت کے ذہن میں جائز رہتی ہے اور مزدک، وہ جھوٹا، ڈھونگی، کم حیثیت، ایک چھوٹے سے آتش کدے کا موبد، ان دونوں اوصاف کو خاطر میں نہیں لاتا... اسے یاد آیا، رخصت ہوتے ہوئے نین دخت نے اس سے کہا تھا:

''ہمیشہ عدل سے کام لینا!''

''میں عدل سے کام لوں گا۔'' خسرو نے دونوں ہاتھوں میں ماں کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا۔ ''لیکن...'' اس کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ ''عدل، میں سزائیں شامل ہوتی ہیں اور شہنشاہ کو سخت گیری سے کام لینا ہوتا ہے۔''

خسرو کو بے طرح نین دخت یاد آنے لگی۔ وہ اب بھی کتنی حسین تھی! خسرو ماں کو بے پناہ

چاہتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ گئے زمانوں میں آریان، ماں اور سگی بہن سے شادی کر سکتے تھے۔ اس طرح نسب قطعی محفوظ رہتا تھا۔ لیکن مدت ہوئی یہ رواج ختم ہو گیا تھا۔ پھر بھی نجیب اولاد کے لیے ترجیح سگے ماموں، چچا، خالہ یا پھوپھی کی اولاد سے شادی کرنے کو ہی دی جاتی تھی۔

ان ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا شہزادہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

آنے والے دو تین دنوں میں شہزادے کے رہائشی انتظامات مکمل کر کے سیاوش کو واپس چلا جانا تھا۔

طیسیفون کی راتیں ایک بار پھر شہریوں کی چیخوں اور آہ و بکا سے گونج اٹھیں۔

حیرہ کے گردونواح کے بدوقبائل پایۂ تخت پر مسلسل حملے کر رہے تھے۔ گشتاسپ نے ان تک کئی بار پیغامات بھیجے کہ اب ان حملوں کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ وزرگان نے بدوقبائلیوں کو حملے بند کرنے کے لیے کچھ رقم دینے کی بھی پیش کش کی، لیکن بدوقبائلیوں کو اب ان مہمات میں لطف آنے لگا تھا۔ طیسیفون سے انھیں اتنا مال و اسباب مل جاتا تھا جو تجارتی قافلوں کو لوٹنے سے کبھی نہ ملا تھا۔ قباد کی جلاوطنی کے بعد وزرگان اور امراء اپنے اسباب کے ساتھ طیسیفون میں واپس آ رہے تھے اور شہر میں مال و اسباب کی فراوانی تھی۔ قیصرِ روم بدوؤں کی ہتھیاروں کی درخواست کبھی مسترد نہیں کرتا تھا۔

''آریان کی سلطنت کی بنیادیں ہلا دو...'' وہ مسکرا کر کہتا۔

حالانکہ قیصر جسٹینین دوسرے کاموں میں بہت مصروف تھا۔ وہ قوانینِ رومیہ مرتب کر کے لکھوا رہا تھا اور اپنے پایۂ تخت میں ایک ایسے عظیم الشان گرجا گھر کی بنیادیں ڈال رہا تھا جس کا ثانی روم کی مغربی سلطنت میں بھی نہ ہو۔

سلطنتِ آریان کی افواج بہ یک وقت تین محاذوں پر مصروف تھیں۔ صوبۂ آرمنیا کی بغاوت فرو ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ دوسری طرف انھیں یہودیوں کی بغاوت کا سامنا تھا جو طیسیفون کے نواحی علاقوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ وہ تنوخ کے بدوؤں سے بھی برسرِ پیکار رہنے پر مجبور تھے۔

ان تینوں محاذوں پر آریان کی مدد کون کر سکتا تھا؟

قباد!

یہ ایک نام تھا جو وزرگان اور امراء میں ایک بار پھر گردش کرنے لگا تھا۔ قباد کے تعلقات حیرہ کے حاکم منذر سے بہت اچھے تھے جو اپنے صحرائی بدوؤں کو قابو میں لا سکتا تھا۔ مملکت کے یہود و نصاریٰ اس سے بدظن نہیں تھے۔ قباد نے انھیں نہ صرف اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی تھی بلکہ وہ

شاندار عبادت گاہوں کی تعمیر بھی کر سکتے تھے۔

''لیکن...'' بزرگان سر پکڑ کر کہتے۔ ''قباد، مزدک کے پنجے میں اسیر ہے۔ ہم اس مزدک کا کیا کریں!''

مزدک پُرسکون تھا۔ اس علاقے میں برسات کسانوں کے لیے مسرت اور خوشحالی کی نوید لائی تھی۔ ان میں سے بیشتر اپنی زمینوں پر واپس جا چکے تھے اور پانی جمع کرنے کے لیے حوضیں تعمیر کر رہے تھے۔ اس کے نئے ساتھی امراء کی وہ اولاد تھی جو درسگاہوں میں زیرِ تعلیم تھی۔ وہ سلطنت کے ہر صوبے سے ہر روز درجنوں کی تعداد میں اس سے ملنے طیسیفون آ رہے تھے۔ وہ پیغمبر کے احکامات کی طویل نقلیں تیار کرتے اور انھیں اپنے صوبوں میں تقسیم کرنے کے لیے ایک نئی امنگ کے ساتھ واپس چلے جاتے۔ اس دوران انھوں نے مزدک کو چند صوبوں میں خود جانے کا مشورہ دیا۔ ان میں قباد کا بڑا بیٹا کاوس بھی شامل تھا۔

''پیغمبرِ محترم... ضرورت ہے کہ آپ صوبوں میں خود جائیے۔ آپ کا پیغام وہ آپ کی زبانی سنیں... سچ تو یہ ہے کہ ہماری اطلاعات کے مطابق، بعض علاقوں میں اس پیغام کو غلط سمجھا جا رہا ہے۔ ایسے لوگ رہنما بن بیٹھے ہیں جو خود کچھ کام کاج نہیں کرنا چاہتے اور لوٹ مار کو ہی زندگی گزارنے کا طریقہ سمجھتے ہیں۔''

مزدک نے شہزادہ کاوس کی بات نہیں ٹالی۔ اس کی نظر میں وہ قباد کا جائز ولی عہد تھا۔ وہ کاوس اور چند دوسرے جوانوں کی معیت میں صوبوں کے سفر کے لیے تیار ہو گیا۔ جانے سے پہلے وہ معزول شہنشاہ بالاش سے ملا۔ بالاش نابینا ہو گیا تھا اور طیسیفون کے نواح میں ایک حویلی میں روپوش تھا۔ موبدوں اور وزرگان نے اس کی آنکھوں میں لوہے کی دہکتی ہوئی سلائی پھروا دی تھی تاکہ وہ آئندہ تخت نشینی کا خواب بھی نہ دیکھ سکے۔

بوڑھا نابینا، مزدک سے مل کر خوش ہوا۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر اس کے ہاتھ اور شانے چھوتے ہوئے بولا:

''ممکن ہوتا تو میں تمھیں اپنے وطن لے جاتا۔ مکران! اور سجستان، سبّی۔ جہاں پٹی ہوئی نہریں ہیں، جہاں کی کھجوریں حیرہ سے بھی زیادہ خوش ذائقہ ہیں اور جہاں سات پہاڑ ہیں۔ نہایت بلند و بالا پہاڑ! ہر پہاڑ کا الگ سردار ہے اور دلیر سیاہ پوش بلوچی ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے اب تو وہاں سب کرشان اور حرفت گر مزدکی کہلاتے ہیں۔ مگر میں تو... میں تو نابینا ہو چکا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''محترم بالاش۔'' مزدک نے افسوس سے کہا۔ ''موبدوں اور وزرگان نے جو ظلم آپ پر کیا ہے اس کا بدلہ انھیں ضرور ملے گا۔ اب یہ ایک دم ٹوٹتی ہوئی طاقت ہیں۔ میں مکران تک تو شاید نہ جا سکوں۔ وہ تو سلطنت کا آخری کنارہ ہے۔ لیکن کسی سے میں آپ کے لیے وہاں کی کھجوریں تو ضرور منگوا دوں گا۔'' مزدک بھاری دل سے بالاش سے رخصت ہوا۔

چند دن بعد شہزادہ کاوس اور اس کے چند ساتھیوں کی معیت میں مزدک اصطخر کے ارادے سے طیسیفون سے نکل گیا۔ اس کے جانے کی خبر سن کر گشتاسپ نے شہنشاہ جاماسپ سے اصرار کیا کہ وہ سپاہ کو مزدکیوں کا قلع قمع کرنے کا حکم دے۔

''میں ایک قتلِ عام کا حکم نہیں دے سکتا۔''

شہنشاہ نے اسے صاف جواب دے دیا۔

''لیکن... شہنشاہِ معظم... ان کی فتنہ پردازیاں ناقابلِ برداشت ہیں۔ ہم آتش کدوں کو دوبارہ کھلواتے ہیں اور فوراً ان میں اشیاء کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کئی مقدس آتش کدوں کو تو انھوں نے حرفت گروں کے ذاتی مکانات میں تبدیل کر دیا ہے۔ بہانہ یہ ہے کہ ان کے پاس رہنے کو گھر نہ تھا۔ اکثر آتش کدوں کو یہ بدبخت دیہاتوں سے آنے والوں کی سرائے بنا چکے ہیں۔ حضورِ والا موبدین بے روزگار ہو رہے ہیں۔''

''یہ تو بہت بری بات ہے۔'' جاماسپ نے کہا۔

''تو حضورِ والا کا کیا حکم ہے؟'' گشتاسپ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میرے خیال میں انھیں معاف کر دینا مناسب ہے۔'' جاماسپ نے اطمینان سے کہا۔ ''اور تلقین کی جائے کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اس مہم پر خرچ کرنے کے لیے ہم خزانے سے مناسب رقم مہیا کر دیں گے۔''

''خزانہ؟ خزانہ تو خالی ہو رہا ہے حضور...'' گشتاسپ نے عاجزی سے کہا۔

''تو یہ رقم وزرگان سے لے لیجیے۔'' جاماسپ نے جواب دیا۔

وزرگان نے گشتاسپ کو مزدکیوں کے قتلِ عام سے باز رکھا۔

''کرشان کام کرنا چھوڑ دیں گے۔ وہ ہماری افواج سے نبرد آزما ہو جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں، ہر بڑی فوجی مہم میں وہ افواج کے ساتھ جاتے ہیں اور بیشتر فوجی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔''

''اور یہ ہماری سب سے بڑی غلطی تھی!''

وزرگان نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور افسوس سے ہاتھ ملے۔

ابدالیوں کے خانات میں قباد کے دن مصروفیت میں گزر رہے تھے۔ اس نے خاقان سے وعدہ کیا تھا کہ سلطنت واپس ملنے پر وہ خاقان اور ابدالیوں کو معقول خراج دے گا۔ ابدالی شہزادی جو اب اس کی نئی بیوی تھی اسے پسند آئی تھی۔ وہ ساسانی دوشیزاؤں سے بہت مختلف تھی۔ دراز قد، بہت اچھی شہ سوار، وہ فن سپہ گری میں ماہر تھی... لیکن زیادہ وقت وہ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ ہی گزارتی جو خاقان کی افواج کا اہم سالار تھا۔

''جیت خان میرے ساتھ تلوار بازی کا مقابلہ بھی کرتا ہے۔'' شہزادی سیرا نے قباد کو بتایا تھا۔

جیت خان، قباد سے خوش دلی اور محبت کے ساتھ ملا۔ ان دونوں نے معانقہ کیا۔ وہ ایک چاق و چوبند اور دلیر ابدالی تھا۔

''میں آپ کے لیے ایک ہزار فوجی دستے تیار کر رہا ہوں۔'' اس نے قباد کو بتایا۔ ''یہ افواج لے کر میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ خاقانِ اعظم نے مجھے ان افواج کا سردار مقرر کیا ہے جو ساسانی فوجوں کو شکست دے کر آپ کو آپ کی سلطنت واپس دلا دیں گی۔''

قباد نے جیت خان کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ جیت خان پر پورا اعتماد کر سکتا ہے۔

نین دخت البتہ ابدالیوں میں گھل مل نہ سکی تھی۔ قباد کی نئی بیوی سے بھی اس کی نہیں بنی تھی۔ وہ اسے عورت نہیں بلکہ مرد معلوم ہوتی تھی حالانکہ شہزادی سیرا بہت حسین تھی۔

نین دخت واپس جانے کے دن گن رہی تھی۔

سیاوش اور اس کے فوجی دستے روزانہ فوجی مشقوں کے بعد ابدالیوں میں گھل مل جاتے جو زیادہ وقت اپنی وسیع و عریض چراگاہوں میں گھوڑوں کی پرورش کرتے ہوئے گزارتے۔ وہ ہر سال گھوڑوں کی کھیپ لے کر مملکتِ خطا کا رخ کرتے جہاں کے حکمران اور امراء گھوڑوں کے بدلے میں بہترین ریشم کے تھان، سونے چاندی کے زیورات اور آرائشی برتن، جن میں بڑی نفاست سے ترشے الماس، نیلم اور یاقوت جڑے ہوتے، اور خوبصورت قالین بخوشی دے دیتے۔ ابدالیوں کے خیمے ان نایاب سوغاتوں سے سجے ہوئے تھے۔

۳۳

بدنظمی اور انتشار کے اس زمانے میں جب دولتِ ساسان کی خبر لینے والا کوئی نہ رہا تھا، جب نہروں اور دریاؤں کے پُل ٹوٹ رہے تھے اور کوئی مرمت کرنے والا نہ تھا، طیسیفون کے گلی کوچے صفائی کے محتاج نظر آنے لگے تھے کیونکہ کارکنوں کو اجرت مزدکی قوانین کے تحت نہیں دی جا رہی تھی اور روزمرہ زندگی نئے اور پرانے احکامات کی کشاکش میں بسر ہو رہی تھی، جوشوا کو عشق ہو گیا۔

دبلی پتلی، نازک اندام فرخندہ اسے دجلہ کے ایک ٹوٹے ہوئے لکڑی کے پل کے کنارے ملی تھی۔ وہ دونوں کسی ڈونگی کے منتظر تھے جو انھیں دریا کے پار لے جا سکے۔

اس انتظار میں وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ فرخندہ اسے پہچانتی تھی۔

''میں نے کرشانوں کے اور حرفت کدوں کے سامنے آپ کی تقریر سنی ہے۔ کتنا اچھا بولتے ہیں آپ... ایک ایک لفظ دل میں اتر جاتا ہے۔'' فرخندہ نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

جوشوا کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے اپنی قوم میں اور مقامی وزرگان سے اپنی بہت ملامت کے ساتھ ساتھ کرشانوں، کان کنوں، اور حرفت گروں سے اپنی بہت تعریف بھی سنی تھی، لیکن کسی تعریف پر اس نے اتنی خوشی تو پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کشتی کے بارے میں سب کچھ بھول گئے۔ جوشوا نے فرخندہ سے کہا:

''کیوں نہ ہم دریا کو تیر کر پار کر لیں۔''

فرخندہ ہنسنے لگی۔ ''لیکن مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔'' اس نے کہا۔ ''طیسیفون میں عورتیں تیرنا کہاں سیکھتی ہیں!''

جوشوا سوچ میں پڑ گیا۔ ''کہیں یہ لڑکی زرتشتی تو نہیں ہے؟'' لباس اور بول چال سے وہ زرتشتی نہیں لگ رہی تھی۔ کاش یہودی ہو! جوشوا نے دل سے دعا کی۔

لیکن وہ یہ بات معلوم کس طرح کرتا۔ کسی کے مذہب کے بارے میں پہلی ہی ملاقات میں استفسار کرنا بدتہذیبی ہوتی۔ آخر اس نے کہا:

''میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں گا۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟''

''دریا پار، کوچۂ مسیحیان میں۔'' فرخندہ نے بتایا۔

''افوہ!'' جوشوا نے ملال سے سوچا۔ ''تو یہ لڑکی مسیحی ہے۔'' لیکن پھر اس نے اپنے دل سے ملال کو دور بھگا دیا۔ اس نے سوچا، اب تو ہم سب مزدکی ہیں۔ یہ لڑکی اس کو اتنا پسند کرتی ہے تو جانتی ہوگی کہ درست دین کو قائم کرنے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔

''دینِ درست تو... آپ کو پسند ہے نا؟'' جوشوا نے ہمت کر کے پوچھا۔

فرخندہ ہنس پڑی۔ اس نے جوشوا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''میرا خاندان تثلیثی مسیحی ہے۔'' پھر مسکرا کر اس نے اپنے سینے پر صلیب بنائی۔

جوشوا پر اس انکشاف کا بہت اثر نہ ہوا۔ وہ اس پیاری لڑکی پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ کشتی میں وہ اس کے پہلو میں بیٹھی۔ دریا کے پار جوشوا اس کو اس کے گھر لے گیا۔

وہ ایک مہذب قدیم عیسائی گھرانہ تھا۔ فرخندہ کا باپ اور بڑا بھائی طبیب تھے اور جالینوس کے پرستار تھے۔

اپنے گھر واپس آ کر جوشوا نے اپنے باپ سے کہا:

''پدرِ بزرگوار... لیکن وہ لڑکی... وہ مسیحی ہیں۔''

جوشوا کا ضعیف باپ دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے کہا:

''چلو ہم لوگ مسیحی مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔'' جوشوا حیرت سے چونک گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! ہم تو... میں تو مزدکی ہوں محترم باپ!''

''نادان مت بنو!'' جوشوا کی ماں نے پیار سے کہا۔ ''تمھارے باپ درست مشورہ دے رہے ہیں۔''

''حالات جس رخ پر جا رہے ہیں، ان کو میری بوڑھی آنکھیں دیکھ بھی سکتی ہیں اور سمجھ بھی سکتی ہیں۔ بہت جلد ہمارا دولتِ ساسان میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ تم گھر سے باہر جاتے ہو تو تمھاری واپسی تک ہماری سانس رکی رہتی ہے۔ اکا دکا مزدکی کو تنہا پا کر قتل کر دینا اب عام سی بات ہو گئی ہے۔ ان کی لاشیں تاریک گوشوں میں ملتی رہی ہیں۔ ہم مسیحی مذہب اختیار کر لیں گے۔ تم اس لڑکی، سے شادی کر لو... اور پھر ہمارا خاندان سرحد پار دولتِ رومیہ میں جا بسے گا... نئے قیصرِ روم کے احکامات کی وجہ سے ہمیں شہریت کے حقوق بھی مل جائیں گے۔''

جوشوا دم بخود باپ کی باتیں سن رہا تھا۔ ساری گزشتہ زندگی تصویروں کی طرح اس کی نظروں میں گھوم رہی تھی۔ مگر ان سب تصویروں پر کشتی میں اپنے پہلو میں بیٹھی ایک نازک اندام لڑکی کی

شبیہہ بار بار چھا جاتی جس نے بہت بھروسے سے اس کا بازو تھام کر کنارے پر قدم رکھا تھا۔

ان کی شادی چند ہی دنوں میں ہوگئی۔ کوچۂ مسیحیان کے ایک کلیسا کے پادری نے آبِ مقدس کے چھینٹے دے کر جوشوا کے خاندان کے تینوں افراد کو یہودی سے تثلیثی مسیحی بنا دیا۔ جوشوا کے باپ کے اصرار پر مزدک کی واپسی سے قبل نو بیاہتا جوڑا قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں جوشوا کا باپ اور ماں، امید کرتے تھے کہ وہ سکون اور اطمینان سے رہ سکیں گے اور بہت جلد پوتے پوتیاں کھلائیں گے۔

''تم قسطنطنیہ میں کتابیں لکھنا۔'' فرخندہ نے اسے مشورہ دیا۔

''تم تو لاطینی بھی جانتے ہو۔ میں نے سنا ہے وہاں ترجمے کا بہت کام مل رہا ہے۔''

جوشوا کے باپ نے اپنا گھر اور اس کا سامان سستے داموں فروخت کر دیا۔ خوشی اور ہجرت کے ناگزیر غم کے جذبات لیے یہ چھوٹا سا خاندان ہمیشہ کے لیے دولتِ ساسان سے رخصت ہو گیا۔ انھیں یقین تھا کہ اپنے نئے یونانی نام کے ساتھ قسطنطنیہ میں انھیں کوئی نہیں پہچانے گا۔

اصطخر میں باغِ بہشتی میں مزدک نے ایک بڑے مناظرے میں شرکت کی جو اس کے اپنے ساتھیوں نے منعقد کرایا تھا۔ اصطخر کا بڑا آتش کدہ بند ہو چکا تھا، لیکن اس کا موبد اپنی زرکار عصا ٹیکتا مناظرے کے لیے آیا۔

باغ مزدوروں اور کارکنوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ مناظرے کا فیصلہ کرنے والوں میں دو موبد اور دو مزدکی شامل تھے۔

''دین تباہ اور سلطنتِ ساسان برباد ہو رہی ہے۔'' موبد نے عصا اٹھا کر کہنا شروع کیا۔ ''ہر طرف بدنظمی ہے۔ نسب اور جائیداد سے محروم کرشانوں نے لوٹ مار کو وطیرہ بنا رکھا ہے۔ ہمیں اس بدعت کا فوری خاتمہ کرنا چاہیے ورنہ ہم صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔''

سننے والوں پر موبد کی باتوں کا کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ صرف پچھلی قطاروں میں بیٹھے چند دبیران نے خوشی کا اظہار کیا جن کو اب صفِ اول میں کوئی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔

پھر مزدک چوبی تخت پر آیا۔ اس نے کہنا شروع کیا:

''عزیزانِ من! سلطنت اس لیے برباد ہو رہی ہے کیونکہ شہنشاہِ سلطنت کو وطن بدر کر دیا گیا ہے۔ اس کے نابالغ چھوٹے بھائی کے سر پر تاجِ شہنشاہی رکھ دیا گیا ہے جس کی اسے ذرا خواہش نہ تھی۔ جو احکامات شہنشاہ قباد نے جاری کیے تھے وہ سب منسوخ کر دیے گئے ہیں۔ اے مملکتِ ساسان کے شہریو! دینِ مزدا کے پرستارو، حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ پایۂ تخت میں خبر گرم

''آپ کی عظیم سلطنت کہ ثانی جس کا ہر دو جہاں میں نہیں، اور جو رقیبوں کو حسد سے موت کی آغوش میں ابدی نیند سے ہم کنار کر دیتی ہے، ہم وزرگان و موبدان آپ کو بلا کسی تردد و زحمت لشکر کشی، آپ کے سپرد کرنے کو دل و جان سے آمادہ ہیں اور قدم بوسی کو اپنی خوش نصیبی قرار دینے کے لیے بے قرار ہیں تاکہ حضور تشریف لائیں اور لعنتِ مزدکی سے دولتِ ساسان کو آزاد کریں جس کے باعث مملکت برباد ہو چکی ہے۔''

سیاوش کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

''لیکن عجلت نہ کیجیے... شہنشاہ معظم۔'' سیاوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مشورہ مستحسن ہے۔''

قباد نے یہ خط اور واپسی کی تجویز خاقان کے سامنے رکھی۔

''بہت خوب!'' خاقان نے کہا۔ ''پیارے داماد۔ ضرور جاؤ۔ مجھ کو یہ کوئی سازش نظر نہیں آتی۔ میرے جاسوس مجھے اطلاع دیتے رہے ہیں کہ تمھاری مملکت کی حالت واقعی ابتر ہے اور تمھیں واپس بلانے کی تجویزیں محلات میں زیر بحث آتی رہتی ہیں۔ مگر... پھر بھی... ابدالی افواج تمھارے ساتھ جائیں گی۔''

قباد کا خیر مقدم پھولوں سے سجے ہوئے طیسیفون نے کیا۔

محل کے پاس باغ میں شہزادہ خسروان کا منتظر تھا۔ نین دخت کی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ اب ایک خوبرو، پورا جوان تھا اس کا بیٹا! خسرو ماں کے قدموں پہ گر پڑا۔

''آپ سے دور رہنا گویا جہنم میں زندگی گزارنا تھا۔'' اس نے نین دخت سے کہا۔

قباد کے سامنے خم ہو کر وہ کورنش بجا لایا۔ قباد اپنے فرزند کو فخر سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنا ولی عہد خسرو کو ہی بنائے گا۔

۳۴

''یہ دروازہ اتنا بلند کیوں ہے؟''

شاہی محل کے دروازے سے گزر کر اندرونی وسیع و عریض میدان میں داخل ہوتے ہوئے پیغمبر سوچ رہا تھا۔ اتنی بلند عمارتیں انسان کو بہت چھوٹا بنا دیتی ہیں۔ اس نے سوچا۔ شاید عمارتوں کو بلند بنایا ہی اس مقصد سے جاتا ہے کہ آدمی خود کو بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس کرنے لگے۔

وہ قباد سے ملنے جا رہا تھا۔ دیوہیکل محراب کے باہر اس کے مریدوں کا غول کھڑا تھا۔ جواب ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن شہنشاہ قباد سے ملنے کی اجازت صرف پیغمبر کو ملی تھی۔ اس کے ساتھ صرف سیاوش تھا جس نے اپنے راکب کو محل سے باہر چھوڑ دیا تھا۔ قباد سے ملنے کے لیے انھیں پیچیدہ راہداریوں سے گزرنا پڑا جہاں سے وہ ایک بار پہلے بھی گزرے تھے۔ لیکن آج پیغمبر کی شہنشاہ سے ملاقات خفیہ نہ تھی۔ دن کی روشنی میں ایک پیغمبر ایک شہنشاہ سے مل رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی تھی۔ جان بچائی تھی ایک دوسرے کی۔ تب سے اب تک مزدک کا نام اس عظیم الشان سلطنت کے دور افتادہ علاقوں تک گونج چکا تھا۔ آج پیغمبر کے قدم پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اعتماد سے اٹھ رہے تھے۔

سیاوش کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔ شہنشاہ اور پیغمبر کے درمیان وہ ایک پُل تھا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں وہ دونوں اس کے دوست تھے۔

کمرۂ خاص میں شہنشاہ ان کے استقبال کے لیے سروقد کھڑا ہو گیا۔

''خوش آمدید پیغمبرِ عزیز!'' اس نے دونوں بازو پھیلا کر کہا۔

''خوش آمدید شہنشاہ... صد ہزار بار خوش آمدید'' مزدک نے مسکرا کر سر خم کیا۔

تب ہی کمرے میں شہزادہ خسرو داخل ہوا۔ پُراعتماد قدموں سے بڑھتا ہوا وہ ان کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

قباد نے فخر سے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا مزدک کو اپنا کوئی کارنامہ دکھایا۔

''خسرو... پیغمبر!''

''خوش آمدید شہزادے...'' مزدک نے کہا۔

کمرے میں موجود تین مہمانوں اور میزبان کے مسرور چہروں کے برعکس شہزادہ خسرو کے

چہرے پر اتھاہ سنجیدگی تھی۔ سیاوش کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔ شہزادہ ہونے پر بھی تنہائی میں وہ سیاوش کو چچا جان کہتا رہا تھا۔ سیاوش نے اس کی جان بچائی تھی۔ اسے سلطنتِ رومیہ کے حوالے کیا تھا جہاں سے وہ ایک چاق و چوبند جوان بن کر واپس آیا تھا۔ افسوس کہ سلطنت کے تقاضے دلوں کے رشتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ پھر بھی، فی الحال تو سیاوش کی سلطنتِ ساسانیہ کے بحیثیت سالارِ اعظم تقرری کے پروانے تیار ہو رہے تھے۔ شاہی پروانوں پر اب بھی موبد موبدان اور وزرائے کبیر کی مہریں ثبت ہوتی تھیں، لیکن شہنشاہ کے دستخط اور مہر کے بعد وزرگان اور موبدان دستاویز پر مہر لگانے کے پابند تھے۔ شہزادہ خسرو نے یہ مہریں شاہی تحویل میں لے لی تھیں۔ قباد کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی ڈھلتی ہوئی عمر میں خسرو کی جوانی کی شاداب قوت سمٹ آئی ہو۔

وہ دبیز قالین پر بچھی جڑاؤ، رومی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

مزدک شہنشاہ کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس کی آمد سے کتنا خوش ہے۔ اس نے یہ افواہیں سن لی تھیں کہ وزرگان قباد کو اس سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کو یہ بھی امید تھی کہ شہزادہ کاوس تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کی اور اس کے مریدوں کی مشکلات دور کر دے گا۔

''میں ولی عہد کے ساتھ اصطخر کے دورے پر گیا تھا شہنشاہِ عالم پناہ۔'' مزدک نے ایک امید سے قباد کو بتایا۔

''ولی عہد؟'' قباد نے حیرت سے کہا۔

''شہزادہ کاوس...'' مزدک کا اعتماد۔

''اوہ!'' قباد نے کہا۔ ''وہ اب تک مجھ سے ملنے نہیں آیا۔''

''وہ طبرستان سے طیسیفون کے راستے میں ہیں شہنشاہ!'' مزدک نے کہا۔ ''فرطِ اشتیاق سے منزلیں مارتے ہوئے قدم بوسی کے لیے آ رہے ہیں۔''

''ہم نے طبرستان کے اچھے حالات نہیں سنے ہیں پیغمبر۔'' خسرو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہاں وزرگان کے محل آئے دن لوٹے جاتے ہیں۔''

''آپ نے غلط سنا ہے۔ دشمن مبالغہ کرتے ہیں اور بات بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں۔'' مزدک نے کہا۔ ''صرف ان احکامات پر عمل ہو رہا ہے جن پر جہاں پناہ کی مہر ثبت ہے۔ اگر کچھ زیادتیاں ہوئی ہیں تو ان کا فوری سدِ باب کیا گیا ہے۔''

مزدک اہورامزدا اور دینِ درست کی تعریف میں اور بھی بہت کچھ کہتا رہا لیکن شہزادہ خسرو اب اور کچھ نہیں سن رہا تھا۔

''طیسیفون کے راستے میں...'' اس کے ذہن میں صرف یہ الفاظ گردش کر رہے تھے۔
''کہاں؟ کس مقام پر؟''

اس رات شہنشاہ کی خواب گاہ میں، جبکہ نین دخت، قباد کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھے اس کے پہلو میں بیٹھی تھی، قباد نے شہزادہ خسرو کی ولی عہدی کے فرمان پر دستخط کر کے اور اپنی مہر ثبت کر کے اسے بیٹے کے حوالے کیا۔ اس فرمان کی دستور کے مطابق تین نقلیں تیار ہوئی تھیں جو سلطنت کے تین بزرگ قاضیوں کو بھیج دی جائیں گی۔ یہ سر بہ مہر فرمان قباد کی موت کے بعد ہی کھولے جا سکتے تھے۔ اور یہ اس کی وراثت کی مصدقہ وصیت تھی جسے کوئی نہیں بدل سکتا تھا۔

''شب بخیر میرے نوشیروان... اے روح لافانی۔ عدل سے حکومت کرنا۔'' نین دخت نے بیٹے کے دونوں رخساروں پر بوسہ دیا۔ اس کمرے میں شہزادہ خسرو گیا تھا لیکن وہاں سے نوشیروان عادل باہر آیا۔ ''بادشاہت کے لیے آہنی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے اے میری حسین اور نازک اندام ماں!'' اس کے دل نے اپنی ماں سے کہا۔ ''لیکن وہ کب سمجھے گی... میں اسے اپنے عدل کی کہانیاں سناؤں گا اور بس...''

اس رات کی صبح ہونے تک شہزادہ کاؤس اور اس کے ساتھیوں کو ایک فیصلہ کن شب خون میں قتل کر دیا گیا۔

مصروف قباد!

یہودان نے اس کے سفیروں کا خیر مقدم کیا ہے۔ انھیں اندازہ ہو چکا ہے کہ شہنشاہ قباد کے آنے کے بعد ساسانی افواج میں پہلی سی یک جہتی پیدا ہو رہی ہے اور اب وہ اس ہفت سالہ جنگ سے تنگ آ چکے ہیں۔ اب سارا معاملہ ان معاہدوں کی شقوں پر اتفاقِ رائے کا جن کے تحت یہودان کے مذہبی حقوق اور ماضی کے تمام منصب بحال کر دیے جائیں گے۔ شہنشاہ کی جانب سے شرط صرف ان کی افواجِ سلطنت میں پہلے کی طرح شرکت کی تھی۔ لگان جمع کرنے اور خزانے کا حساب رکھنے کے سلسلے میں وہ یہودان کی کارکردگی پر مطمئن تھا۔

تنوخ قبائل کو لگام دینے کے لیے اسے شہنشاہِ روم کی مدد کی ضرورت تھی۔ دولت کے لالچ نے انھیں حیرہ کے حاکم منذر کی وفاداری سے تقریباً خارج کر دیا تھا۔

اس چھوٹی سی عرب مملکت میں شاہ منذر کا تختہ الٹنے کی کئی کوششیں ہو چکی تھیں۔ ضرورت تو ان ہتھیاروں کی ترسیل روکنے کی تھی جو قسطنطنیہ سے تنوخ قبائل کو وصول ہوتے رہتے تھے اور شہنشاہ جسٹینین؟ وہ قباد سے کچھ کم مصروف نہ تھا۔ گو اس کی نظریں مغرب کی طرف اور خود قسطنطنیہ پر لگی تھیں۔

۳۵

''صفحۂ دہر پر میں اپنا نام ثبت کر جاؤں گا۔'' جسٹینین کا دل گواہی دیتا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ خدا باپ خود اس سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ سلطنت روم کو اس کی شوکت رفتہ واپس دلا دے۔ اس کے پیارے سپہ سالاروں نے ہسپانیہ فتح کر لیا تھا اور گوتھ قبائل اور بدبخت وندالوں کو مار بھگایا تھا۔ ان میں سے بیشتر مسیحی ہو کر اطاعت قبول کر چکے تھے اور بقیہ سمندروں کے ساحلوں پر آوارہ گھوم رہے تھے۔ سلطنت کے لیے مذہبی ہم آہنگی لازمی تھی اور جسٹینین کو ہنوز مذہبی تنازعات نے گھیر رکھا تھا۔ خدائے خداوند یسوع مسیح ایک تھے یا دو تھے؟ وہ انسان تھے کہ خدا تھے؟ یہ مسئلہ حل ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ صرف قسطنطنیہ کے پادری اس کی مدد کو آگے بڑھ رہے تھے۔

''یقیناً دو تھے جو یسوع مسیح میں یکجا ہوئے۔'' وہ اس کو تسلّی دیتے۔ ''دیکھیے، ان کے وجود کا ایک رخ وہ تھا جو معجزے کرتا تھا اور دوسرا وہ جو انسانی تھا۔ جسے انسانوں کی طرح چوٹ لگ سکتی تھی۔ یعنی جو صلیب پر مر گئے۔ یہ دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس طرح تو صلیب پر خدا مر جائے گا اور پھر دنیا خدا کے بغیر کیسے چل سکتی ہے؟''

بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ اور ان میں ہی روح القدس تھی۔ یہ دو نہیں تین تھے۔

''ہاں۔ تین... تین!'' پادری اسے یقین دلاتے۔

''اب اس پر مزید بحث نہیں ہونی چاہیے!'' جسٹینین نے میز پر سونے کی ہتھوڑی سے زور سے ضرب لگا کر کہا تھا۔

اس نے سلطنتِ رومیہ سے یونانی فلسفہ طرازی کا بھی خاتمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جن کے مرید نت نئی پہیلیاں بجھواتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ ایجپٹس (مصر) بھاگ گئے تھے اور کچھ نے ساسانی سلطنت میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سلطنتِ مسیحیان پر یونانی چھاپ سے عاجز آ گیا تھا۔ وہ لاطینی کا احیا چاہتا تھا جو اس کی مادری زبان تھی اور یقیناً عیسائیت کی بھی زبان تھی۔ یا کم از کم اسے عیسائیت کی زبان ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایسی زبان جسے اب بہت کم لوگ سمجھتے یا بولتے تھے اور اسی لیے اس کا اپنا رعب تھا جبکہ یونانی ایک عام سی زبان تھی، جسے قسطنطنیہ میں مچھلی بیچنے والا بھی سمجھ جاتا تھا۔ لیکن کسی بھی بات کو لاطینی میں کہا جائے تو اس میں ایک رعب و داب

خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

شہنشاہ جسٹینین قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان گرجا گھر کی تعمیر بھی شروع کرا چکا تھا۔ پہلے اس مقام پر ایک یونانی گرجا گھر تھا جو خدائے دانش کے نام معنون تھا۔ دانش کو ہی یونانی میں ''سوفیا'' کہتے تھے۔ اور دانش کیا تھی؟ پھر وہی یونانی لفظ مل سکا یوگوز... یہ بات عاجز کر دینے والی تھی کہ یونانی میں اتنا کچھ پہلے ہی لکھا جا چکا تھا۔ لاطینی میں الفاظ اتنے زیادہ نہ تھے افسوس! جسٹینین سوچتا۔

مقامی پادریوں نے اسے سمجھایا۔ دانش تو بات چیت کرنے سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ پس تو اس کا مطلب ہوا لفظ...

''آغاز میں بس لفظ تھا اور لفظ خدا کے پاس تھا اور...''

''اور کیا؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''اور بس لفظ ہی خدا تھا۔ اور کیا ہو سکتا ہے شہنشاہِ معظم...''

پھر انھوں نے ریاضی کی ایک مساوات کاغذ پر بنائی۔

اس پر تو لامذہب اقلیدیس بھی رشک کرتا۔

یہ ایک مثلث تھی۔ اس کے درمیان ایک اور مثلث تھی اور اس کے درمیان ایک دائرہ تھا۔

دائرے میں جلی حروف میں لکھا گیا۔ خدا۔

بیرونی مثلث کہہ رہی تھی۔

باپ = نہیں ہے بیٹا۔

بیٹا = نہیں ہے روح القدس۔

روح القدس = نہیں باپ۔

اور اندرونی مثلث کہہ رہی تھی۔

باپ = ہے خدا۔

بیٹا ہے = خدا۔

روح القدس ہے = خدا۔

''اب تو بات صاف ہو گئی ہو گی؟'' بڑے پادری نے تشویش سے پوچھا۔

بات خاک صاف نہ ہوئی تھی لیکن جسٹینین کی نظر میں یہ بات بالکل صاف تھی کہ اس عظیم الشان گرجا گھر کو بنانے کے لیے اسے خطیر رقم درکار ہے۔ کیا وہ سلطنتِ رومیہ میں مزید لگان لگا سکتا ہے؟ اس کا وزیرِ خزانہ کہہ رہا تھا۔ ''شاید نہیں۔''

مغربی سرحدوں کی فوجی مہمات کے لیے اتنی رقم درکار تھی کہ خزانہ خالی ہو رہا تھا۔
اس لیے جب اس کے پاس قباد کے سفارت کار شاہی ولی عہد کی حفاظت پر ممنون شہنشاہ کا شکریہ کا پیغام لے کر پہنچے تو وہ خوش ہو گیا۔
''تنوخ قبائل کیا حیثیت رکھتے ہیں! ہم ان کو ایک تیر اور ایک خنجر بھی نہ دیں گے۔ آیئے ہم امن کا معاہدہ کرتے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے امن کا معاہدہ!''
قباد کے قاصد خوشی سے اچھل پڑے۔ ''کیا یہ ممکن تھا؟''
''بس شرط یہ ہے کہ شہنشاہ قباد سلطنتِ روما کو پانچ سو پاؤنڈ وزن کا سونا دیں۔ ہم فوراً معاہدے پر دستخط کر دیں گے۔''
ساسانی سفارت کاروں کے چہرے اتر گئے۔
''قیصرِ اعظم! ہماری سلطنت اپنے مسائل سے دوچار ہے۔'' انھوں نے کہنا شروع کیا۔ لیکن پھر وہ رک گئے۔ اس دوست نما دشمن اور دشمن نما دوست کے سامنے سلطنت کا ہر راز آشکار نہیں کیا جا سکتا۔
''ہم آپ کا پیغام لے جاتے ہیں۔ اس تاابد معاہدہ امن کے لیے سونا مہیا کرنے کی پوری کوششیں کریں گے۔ لیکن اب تنوخ قبائل کے حملے بند ہو جائیں گے۔ آپ ہمیں یقین دہانی کروا دیجیے۔''
''آج سے ہی بند...'' شاہ جسٹینین نے کہا۔ اس کے وزراء نے بھی جوش و خروش سے سر ہلایا۔
اس خوش خبری کے ساتھ ساسانی وفد سوئے وطن روانہ ہوا۔ لیکن وہ اس شاندار محل میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے چوہوں کی بہتات سے حیران تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق چوہے یزدان نے نہیں اہرمن نے تخلیق کیے تھے۔ تب کیا اہرمن اس عظیم الشان سلطنت کے پایۂ تخت پر غالب آ رہا ہے؟
ایک قاصد مزدک کے پاس بھی پہنچا تھا۔ وہ قسطنطنیہ سے اس کے پیارے ساتھی جوشوا کا پیغام لایا تھا:

''بے حد افسوس ہے کہ آتے ہوئے آپ سے مل نہ سکا اور اب ہم یہاں ہیں۔ غلاموں سے بھرے ہوئے اس جگمگاتے شہر میں۔ یہ زیادہ تر کرشانوں کے ہی بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ یہ جاگیری زمینوں پر کاشت کرتے ہیں اور قرضہ واپس نہ دے سکنے کے باعث جاگیرداروں کی غلامی میں آ جاتے ہیں۔ وہی لوگ انھیں شہروں کی منڈیوں میں فروخت کر دیتے ہیں۔ ان کے بچے پیدائشی غلام ہوتے ہیں اور بعض کو بچپن میں ہیجڑا بھی بنا دیتے ہیں تاکہ گھروں کے اندر اور نوابین کی حویلیوں اور شاہی محلات میں کام کر سکیں۔
''اس عظیم الشان شہر کے اطراف غریبوں کی آبادیاں پھیلی ہیں، جہاں ایک چھوٹے سے

کمرے میں بڑے بڑے خاندان رہتے ہیں۔ شہر کے رحم دل امراء ان کے لیے پکی ہوئی روٹیاں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک لنگر خانہ شہنشاہ کا بھی ہے۔ ان لنگروں پر غریب غرباء میں اکثر ہاتھا پائی ہو جاتی ہے اور پھر قسطنطنیہ کے ہتھیار بند اہلکاروں کو انھیں درے مار مار کر علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے بھی بعض کو قرضہ واپس نہ کرنے کے باعث غلام بنا کر بیچ دیا جاتا ہے۔

''ہم لوگوں نے شہر کے مغربی حصّے میں چار کمروں کا مکان لیا ہے جہاں ہم، میرے خسر اور سالے کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ کل خسر بزرگوار منڈی سے دو غلام خرید کر لائے ہیں جن میں نوعمر تو دس تومینس ماتا کا ملا، یہ آپ دس ساسانی دیناروں کے برابر سمجھیے۔ دوسرا پوری عمر کا ہے جو تقریباً بیس دینار کا ملا۔ ہیجڑے، بچے اور بالغ غلام ان کے مقابلے میں زیادہ مہنگے تھے۔ غلاموں میں کچھ جنگی قیدی بھی ہیں لیکن وہ یہاں کی زبان سے ناواقف ہیں۔

''اے میرے جگری دوست اور استاد، میں نے تہیہ کیا ہے کہ آپ کے پیغام کو سب سے پہلے میں خود ان غلاموں تک پہنچاؤں گا اور پھر ان کے ذریعے شہر کے دوسرے مزدوروں اور حرفت کاروں تک پھیلا دوں گا۔

''یہاں ایک سخت تکلیف دہ صورتِ حال یہ پیدا ہوئی ہے کہ شہر میں طاعون کی وبا پھوٹ نکلی ہے اور غریب آبادیوں میں بڑے پیمانے پر روز اموات ہو رہی ہیں۔ میرے خسر اور نسبتی بھائی طبیب ہیں اور سخت مشقت سے شب و روز ان کے علاج معالجے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھ کبھی کبھی میرا بھی ان غریب بستیوں میں جانا ہوتا ہے۔

''پیارے دوست، سننے میں آ رہا ہے کہ کرشانوں میں اموات کی شرح شہروں سے بہت زیادہ ہے۔ ایک ایک کھیت سے روز سینکڑوں جنازے اٹھ رہے ہیں، اس کے باوجود شہنشاہ اور اس کے کارندے لگان میں آدھے درہم کے برابر بھی رعایت نہیں کر رہے اور درے پھٹکارتے ہوئے ان مرتے ہوئے کرشانوں سے پوری رقم وصول کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کرشانوں میں غلاموں کی تعداد بہت بڑھنے والی ہے۔ شہنشاہِ روما کو ان کی ضرورت بھی ہے کیونکہ وہ اپنے پیغامبر یسوع مسیح کے نام پر ایک بہت بڑے گرجا گھر کی تعمیر شروع کر چکا ہے۔ تعجب ہوتا ہے یسوع مسیح کے گرجا کے لیے بے کسوں پر اتنا ستم کرنے والا کہ بادشاہ یسوع کو ہی رحمت اور کرم کا پیکر مانتا ہے!''

''زندہ بچے تو بہت جلد آپ سے ملنے آئیں گے۔

تا ابد آپ کا دوست
جوشوا''

''تا ابد!'' مزدک نے دُہرایا۔ ''یہ ایک نامعلوم عرصہ ہے۔''

۳۶

''تا ابد!'' قباد نے خوش ہوکر دُہرایا۔ ''وہ توکس نے دیکھا ہے!... لیکن یہ خیال بہت اچھا ہے۔ سلطنتِ روما سے تا ابد امن کا معاہدہ!'' وہ پانچ سو پاؤنڈ سونے کی وصولی کی فکر میں غرق ہوگیا۔ وہ اپنے دوست ابدالیوں سے مدد مانگ سکتا تھا لیکن ان کے پاس سونا نہیں، نہایت اعلیٰ نسل کے گھوڑے تھے، یا جنگجو سوار...

''توکیا وزرگان پر اور موبدان پر دباؤ ڈالا جائے؟'' قباد نے اپنے فرزند سے پوچھا۔ وہ گزشتہ چند دنوں سے کچھ بیمار رہنے لگا تھا۔

''میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دوں گا۔'' خسرو نوشیروان نے باپ سے کہا۔ ''ہم نے دوبارہ سلطنت حال ہی میں سنبھالی ہے۔ مدبران اور بزرگان کو فوراً ناراض کرنا مناسب نہیں ہے۔ پدرِ بزرگوار... یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیئے آپ گزشتہ کئی دنوں سے مسلسل کام کر رہے ہیں۔ آپ کو کچھ دن آرام کی بہت ضرورت ہے۔''

قباد نے بیٹے کو مسکرا کر مطمئن نظروں سے دیکھا۔ چند دنوں کے بعد وہ نین دخت کے ساتھ اصطخر کے جوار میں اپنے خوبصورت شاہی محل میں کچھ عرصہ گزارنے کے لیے چلا گیا۔

دریائے کرخہ کے کنارے سنگِ سرخ کا یہ چھوٹا سا محل قباد نے اپنے اور اپنی ملکہ کے لیے بہت ارمان سے بنوایا تھا۔ اس سے پہلے حالات نے اسے یہاں سکون وچین سے ایک چاند کے دو کنارے دیکھنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ آج وہ نین دخت کے ساتھ یہاں آرام کرنے آیا تھا تو بخار اس کے بدن کو نہیں چھوڑ رہا تھا۔ پھر بھی قباد مطمئن اور پرسکون تھا۔ وہ نین دخت کے ساتھ دریا کے کنارے وسیع رمنے میں بیٹھا، کنارے پر لنگر انداز ایک سفید کشتی کو دیکھ رہا تھا جو ہلکی لہروں پر جنبش کر رہی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے تیر رہی ہو۔ رمنے میں چوکڑیاں بھرتے ہرن انھیں دیکھ کر درختوں میں چھپ گئے تھے۔ ہوا کے کسی تیز جھونکے سے شاخیں پلٹتیں تو ان کے نرم، پھڑکتے ہوئے کان یا بڑی بڑی آنکھوں کی ایک جھلک سی دکھائی پڑتی۔ دور کہیں دریا کے پار ایک پن چکی گھوم رہی تھی جس میں اناج ڈالتے اور پشت پر آٹے کے گٹھر لے جاتے بارگیر چھوٹے چھوٹے بونوں کی طرح حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ قباد انھیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

''اب تو شاید یہ بھوکے پیاسے نہ رہتے ہوں گے۔'' اس نے بہت آہستہ سے زیرِلب کہا۔

''نہیں عالم پناہ! میری آنکھوں کی روشنی!'' نین دخت نے کہا۔ ''قحط بھی ختم ہو گیا ہے اور ان کو پوری مزدوری بھی ملتی ہے۔''

قباد کو مزدک کا خیال آیا۔ ''کہاں ہو گا وہ نیا پیمبر... اس نے قباد کی جان بچائی تھی اور اس کی سلطنت بھی۔''

''خسرو سے کہنا، مزدک کے ساتھ زیادہ سختی نہ کرے۔'' اس نے نین دخت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''آپ کیوں ایسا فرما رہے ہیں جہاں پناہ... کاروبار و مملکت آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہاں سے واپس جا کر آپ خود مزدک سے تفصیلی ملاقات کیجیے گا۔''

قباد مسکرانے لگا۔

''اندر چلو!'' وہ نین دخت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

خواصیں دُہری ہو کر اس سے پوچھنے لگیں:

''خاصہ تناول فرمایئے گا عالم پناہ!''

ٹھنڈے اور گرم گوشت، زیتون کے رس میں پکائے ہوئے ریشمی چاول، افیون کے بیجوں پر پالے ہوئے مرغ جن کے گوشت میں نشہ ہو، پستے اور باداموں کے حلوہ جات...

''نہیں...'' قباد دھیرے سے مسکرایا۔ نین دخت پریشان ہو گئی۔ قباد کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں وہ اسے خواب گاہ میں لے گئی۔ شاہی طبیب اور اس کے مددگاروں کو خواب گاہ میں طلب کر لیا گیا۔ طبیب شہنشاہ کو شربت پلانے کی کوششیں کرتا رہا جو اس کے لیے خاص طور پر تیار کیے گئے تھے تاکہ اسے دوا کی تلخی محسوس نہ ہو۔ اس کے پیروں، پیشانی اور چہرے پر معطر یخ بستہ پانی میں بھیگے خالص سوت کے رومالوں کو آہستہ آہستہ ملا جانے لگا۔

نرم، ریشمی شاہی بستر پر قباد نے کروٹ لی اور اپنے ہاتھ کے طلائی، سچے موتیوں کے جوشن کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ہمارے نجومی کو دے دینا۔'' اس نے نین دخت سے کہا جو اس کے سرہانے مورتی کی طرح ساکت کھڑی تھی جبکہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اس رات کسی پہر قباد نے آخری سانس لی۔ برق رفتار گھوڑوں پر دو سوار پایۂ تخت تک یہ خبر پہنچانے سرِشام ہی نکل گئے تھے۔

خسرو نوشیروان کا وہ دن اعصاب شکن مصروفیت میں گزرا تھا، حالانکہ وہ ناشتے اور کھانے کے علاوہ اپنی خواب گاہ سے نہیں نکلا تھا، لیکن اسے ایک ایک ساعت کی خبر وصول ہوتی رہی تھی۔

۳۷

سیاوش کا پروانۂ سپہ سالاری التوا میں تو پہلے ہی ڈالا جا چکا تھا۔ اس پر شاہی مہر ثبت کرنے سے پہلے شہنشاہ اصطخر کی طرف روانہ ہو گیا تھا اور موبدان و وزرگان نے اس پر سنگین اعتراضات اٹھائے تھے۔ آج اسے قاضی کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔ آج کا دن اس کی قسمت کے فیصلے کا دن تھا۔

''کیا تم دینِ زرتشت پر اب بھی قائم ہو؟''

''جی جناب۔''

''لیکن تمھاری بیوی کی حال ہی میں موت ہوئی ہے۔ تم نے اسے دخمے پر نہیں رکھوایا۔ تم نے تو اسے دفن کروایا۔''

''جنابِ والا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میں تو ایک سپاہ بذ ہوں۔ ایسے ساسانی شہنشاہ بھی گزرے ہیں جنھوں نے دفن ہونا پسند کیا۔''

''کیا تمھاری بیوی نے خود دفن ہونا پسند کیا تھا۔ کیا یہ اس کی وصیت تھی۔ اگر ہاں، تو کیا اس کا کوئی ثبوت ہے؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا، جناب والا۔''

''تو کیا تم نے ایک زنِ زرتشتی کو اس کی رضا کے بغیر اس طرح حقیر خاک کے سپرد کیا جیسا کہ عیسایان اور یہودیان کرتے ہیں۔''

سیاوش خاموش رہا۔ وہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ خاک بھی مقدس ہے۔ وہ مزدک کے دینِ درست کو اپنے مقدمے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اور کیا تم نئی نئی دیویوں کی پرستش نہیں کرنے لگے ہو؟''

''نہیں جنابِ عالی۔''

''مثلاً خوشی کی دیوی۔''

''یہ تو مقدس دینِ زرتشت میں شامل ہے جنابِ عالی۔''

''کیا یہ مانی کی بدعت نہیں؟''

قاضیانِ عدالت کے قلم جنبش میں تھے۔

''سیاوش مجرمِ دین ہے۔ واجبِ قتل۔''

''سینے میں چھرا بھونک کر ختم کیجیے۔'' خسرو کا پیغام۔ ''نعش کو مسخ نہ کیا جائے۔ سالم نعش کو صبح دم تعظیم کے ساتھ شاہی پہاڑ پر دخمے پر رکھ دیجیے۔''

''خدا حافظ چچا جان!'' خسرو نوشیروان نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کے دونوں دوستوں نے سلطنتِ ساسان کو تباہ کر دیا۔ اور آپ... آپ انھیں چھوڑ نہیں سکیں گے۔''

دوسری صبح اسے باپ کی نعش، پایۂ تخت لانے کے لیے اصطخر روانہ ہونا تھا۔

۳۸

خسرو نوشیروان کی تاج پوشی میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی۔ ایک معمولی سی سازش کی گئی لیکن اسے شہنشاہ کی سپاہ نے کچل دیا۔

اور شہنشاہِ ساسان نے تاج پوشی کے جشن میں تمام صوبجات کے شاہوں کو مدعو کرنے کے لیے ایک خط خود تحریر کروایا۔ یہ ایک طنز نگاری کی مثال تھا جس کی ابتدا اس نے اپنے باپ کی وفات پر افسوس کے اظہار کے ساتھ کی تھی لیکن اس طرح کہ الفاظ کے پیچھے اصل مفہوم آشکار ہو جائے۔

''ادائے رسوماتِ آداب کے بعد واضح ہو کہ کوئی چیز لوگوں کے لیے اس قدر خوف کا باعث نہیں ہو سکتی جتنا ایک ایسے بادشاہ کا دنیا سے اٹھ جانا جس کی عدم موجودگی سے فتنے برپا ہوں، اور نیک لوگوں پر، ان کے خدام پر، ان کے مال پر، اور ہر اس چیز پر آفتیں نازل ہوں جو انھیں عزیز ہوں۔ ہم کسی چیز کو لوگوں کے لیے اتنا نقصان کار نہیں سمجھتے، جتنا کہ ایک اچھے بادشاہ کا دنیا سے اٹھ جانا...''

وزرگان نے یہ خط پڑھ کر آرام کا سانس لیا اور چپکے سے مسکرائے۔ موبد موبدان نے اپنے طویل ریشمی سرخ لبادے کو لہرا کر لپیٹا اور داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گشتاسپ سے کہا:

''خسرو ہمیں پہلے جیسے اختیارات نہیں دے گا— یہ خوب سمجھ لیجیے۔ یہ باپ سے زیادہ ضدی ہے۔''

گشتاسپ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کم از کم ہماری جائیدادیں اور جاگیریں تو نہیں چھینے گا۔ فی الحال اس پر اکتفا کیجیے۔''

پایۂ تخت کے عین درمیان دجیل تمکنت سے بہہ رہا تھا۔ اس سے نکلتی نہرِ سرسر کے کنارے مزدک اپنی عصا سنبھالے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ وسیع شاہراہ پر اس کے پیچھے اس کے سینکڑوں مریدوں کا غول ساتھ چل رہا تھا۔

یہ دور دراز کے دیہاتوں سے آنے والے کسان اور کان کن تھے، شہر کے درزی تھے، درسگاہوں کے استاد، ان میں جھاڑو دینے والے اور کوڑا اٹھانے والے روز کے مزدور تھے، موچی اور کمہار تھے۔

نہر کے مشرقی کنارے پر پایۂ تخت کا سب سے بڑا کلیسا تھا۔ اس کی وسیع اور بلند و بالا سفید عمارت دور سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ملحق خانقاہ میں سو کمرے راہبوں کی رہائش کے لیے مخصوص تھے۔ آج مزدک کا ان راہبوں سے مناظرہ ہونے والا تھا۔

دور سے ایک چار گھوڑوں والی رتھ پوری رفتار سے ان کی طرف آتی نظر آئی۔ مزدک کے ساتھی تیز قدموں سے نہر کے کنارے کی طرف ہو لیے۔ انھوں نے برق رفتاری سے بڑھتی ہوئی رتھ کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا۔

''بالکل میرے سامنے ہے۔'' رتھ میں سوار ایک امیر نے آہستہ سے کہا، حالانکہ وہ مزدک اور اس کے ساتھیوں سے بہت دور تھے۔

''چاہوں تو ابھی میرا تیر بد بخت کے سینے کے پار ہو سکتا ہے۔''

''نہیں!'' امیر کے ساتھی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یوں نہیں... ہم قاعدے اور قانون سے چلیں گے۔''

رتھ ہجوم کے برابر سے دھول کا بادل اڑاتی ہوئی نکل گئی... مزدک ہاتھ منھ دھونے نہر کے پانی میں اترا۔ اس کے ساتھی بھی منھ میں پڑنے والی خاک دھونے لگے۔ انھوں نے کچھ دیر آرام کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے اپنے کاندھوں سے بندھی پوٹلیاں کھولیں اور نان اور پیاز اور کھیرے کھانے بیٹھے۔

مزدک نے اَوِستا کی دعائیں پڑھ کر پہلا لقمہ لیا۔

''کیا ہم بھی کبھی...'' ایک خاکروب نے کہا... اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''کیا ہم بھی کبھی رتھوں میں سفر کر سکیں گے پیغمبر؟''

مزدک نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان میں تو دس بارہ لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ صرف ایک یا دو امراء کے لیے نہیں بنیں۔''

''طیسیفون میں اتنی رتھیں ہیں کہ ان میں ہم سب بیٹھ سکتے ہیں۔'' ایک درزی نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔

''اور ہر روز وزرگان طیسیفون واپس آ رہے ہیں، اور ان کے ساتھ چار چار رتھیں ہوتی ہیں۔'' ایک کان کن نے کہا۔ ''پیغمبران سے یہ سب چھین لینا تو دو ساعتوں کی بات ہے۔ نہ جانے کیوں آپ اب ہمیں اجازت نہیں دیتے۔''

''نہیں...'' مزدک نے سر ہلایا۔ ''خوراک تک دوسری بات تھی۔ وہ ان سے چھین لو۔

دوسری باتوں پر... '' اس نے رک کر کہا۔

''ہم انھیں قائل کریں گے۔''

مزدک کے ساتھی دھیرے دھیرے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ انھیں اپنے پیغمبر کی خوش بیانی پر پورا اعتماد تھا۔ ہر محلّے میں اب ان کے پیشوا مقرر ہو گئے تھے۔ اب وہ ان کی ہدایت پر ہی کوئی قدم اٹھا سکتے تھے۔ اور ان کے درمیان تھا ان کا پیغمبر مزدک، جسے گفتگو میں کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن وہ دل شکستہ بھی تھے۔ ان کا محبوب شہنشاہ قباد اب دنیا میں نہیں تھا۔ پیغمبر کے یار جانی سپہ بذ سیاوش کو سزائے موت دی جا چکی تھی۔ شہر میں ہنگامے اٹھے تھے لیکن چل نہ سکے تھے کیونکہ جانے والا تو جا چکا تھا۔ وزرگان کی حویلیاں جلانے سے وہ واپس نہیں آ جاتا۔ ساسانی سپاہ اب ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ہنگامے دب گئے۔ وزرگان اور امراء کی جاگیری سپاہ نے اب ان کو سختی سے دھتکارنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

۳۹

جب مزدک کو شاہی محل میں مناظرے کا دعوت نامہ ملا تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ محفل دیوانِ عام کی جگہ دیوان خاص میں منعقد ہوگی۔ شہر میں صبح سے نقارہ بجایا جا چکا تھا کہ مملکتِ ساسان کے بہترین علماء آج خود طاقِ کسریٰ میں اس شخص کے ساتھ مناظرہ کریں گے جو اپنے آپ کو پیغمبر کہنے لگا ہے، لیکن مناظرے میں شرکت کا دعوت نامہ عام شہریوں کو موصول نہیں ہوا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ صبح دم سے طیسیفون کے ہر کوچے اور ہر محلے میں شاہی ہتھیار بند ہرکارے بڑی عزت و احترام سے مزدک کے مریدوں کے پیشیواؤں کو اپنے ساتھ دو گھوڑوں والی رتھوں میں بٹھا کر شاہی محل لے جاتے رہے تھے۔

''صرف ان کو مناظرے میں لطف اندوز ہونے کی اجازت ہے۔'' انھوں نے پوچھنے والوں سے کہا تھا۔

شہر مزدک کے پیشواؤں سے خالی ہو گیا۔ وہ سب مناظرے کے لیے شاہی محل لے جائے جا چکے تھے۔

مزدک کو محرابِ کسریٰ میں داخل ہونے کے فوراً بعد شاہی فوجی دستوں نے اپنے گھیرے میں دیوانِ خاص پہنچا دیا۔

دیوان خاص بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ایک ایک زرنگار نشست پر ایک سے ایک قابل مباحثہ کرنے والے موبد متمکن تھے۔ خوبصورت بھاری قالینوں سے ڈھکے ہوئے چوبی تخت پر پسر ماہزاد، بینوشاپور، آذر فربگ، آذر بد، آذر مہر اور بخت آفرید جیسے طاقت ور وزرگان کروفر کے ساتھ متمکن تھے۔ وہ مناظرے میں شرکت بھی کر رہے تھے اور مناظرے کے منصف بھی تھے۔

''لیکن میری طرف کے منصف؟'' مزدک نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

''وہ بس آتے ہی ہوں گے۔'' چوبداروں نے اس کی تسلی کرائی۔

جب دیوان میں خسرو نوشیروان نے قدم رکھا تو دیوان میں موجود ہر شخص سروقد کھڑا ہو گیا۔ ان کی نگاہیں اور سر جھکے ہوئے تھے۔ صرف مزدک نئے شہنشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہا تھا۔ نوشیروان تلخی سے مسکرایا۔ اور ایک تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''آغاز ہو!'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

ایک کے بعد ایک مقررینِ دین مزدک کی دھجیاں اڑاتے رہے۔ بولنے والوں میں سلطنت کے یہودان اور مسیحان کے نمائندے بھی شامل تھے۔

تقریریں جاری تھیں۔

''اے شخص تو نے عظیم الشان سلطنتِ ساسانیہ کو برباد کر دیا۔ آج ناموس و ادب کا پردہ اٹھ چکا ہے۔ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن میں نہ موروثی جاگیر ہے، نہ صنعت، نہ حرفت۔ کسان بغاوتیں کر رہے ہیں، امراء کے محلوں میں گھس کر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ جاگیروں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ ابتری اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ان سب فتنہ پردازوں کو بدترین سزا نوموتوں سے ہم کنار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔''

''سزائے موت! سزائے موت! سزائے موت!''

دیوانِ خاص امراء اور وزرگان کے نعروں سے گونج اٹھا۔

''سزائے موت شہنشاہ قباد نے ختم کر دی تھی۔'' مزدک نے اعتماد سے کہا۔ ''میرے پاس ان کے احکامات کی نقل موجود ہے۔''

''وہ احکامات ہم نے طاقِ کسریٰ کے رمنا میں دفن کر دیے ہیں۔ کیا تم ان کو دیکھنا چاہو گے؟''

خسرو نوشیروان خود اس سے مخاطب تھا۔

شاہی دستے مزدک کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر محل کی پشت کی طرف وسیع و عریض رمنے میں لے گئے۔

پہلے پہل تو مزدک کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ جہاں تک نگاہ جا سکتی تھی زمین پر درختوں کی طرح انسانی ٹانگیں اُگی ہوئی تھیں جن کے پیر آسمان کی طرف تھے۔

''تم سب کچھ الٹنا چاہتے تھے نا۔'' یہ گشتاسپ کی آواز تھی۔

''یہ ہیں تمھارے دین کے سب پیشوا۔ دیکھو، الٹے ہو کر وہ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ ہم نے تمھارے لیے ان کا ایک جنگل اُگایا ہے۔''

مزدک نے اپنی گردن کی پشت پر خنجر کی تیز دھار محسوس کی۔ اس کے دونوں بازو اب پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔

مزدک نے اپنے سامنے خسرو نوشیروان کو دیکھا۔ وہ قد میں اس سے دو بالشت بلند تھا۔ اس کے گلے میں سچے موتیوں کی مالا تھی اور سر پر سفید کلغی کی بہت قیمتی کلاہ۔

اب مزدک کو اپنے چند لمحوں میں قتل ہو جانے میں شک نہیں رہا۔ اس کو اپنی بیوی یاد آئی جو حاملہ تھی۔

''خسرو!'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم میری جان لو گے۔ یہ گناہ ہے۔ جن کو قتل کیا جاتا ہے ان کی ارواح قید عناصر سے نہیں نکل سکتیں۔ وہ ہمیشہ بھٹکتی رہتی ہیں۔''

اس کی بات کا جواب خسرو نوشیروان کے مضبوط بازو کا گھماؤ تھا اور خنجر کا مشاقانہ وار جس نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ مزدک کا بریدہ سر نوشیروان کی ہیرے جڑی جوتیوں میں تھوڑی دیر لڑھکتا رہا۔

خدام نے دوڑ کر مزدک کی لاش کو اور بریدہ سر کو شہنشاہ کے قدموں سے اٹھا لیا۔ وہ اسے فوراً دور لے گئے۔

مناظرے کے مدعوئین دم بخود رخصت ہوئے۔ یہ بات ان کو ناقابلِ یقین لگ رہی تھی کہ مزدک جیسا فتنہ بالآخر فرو ہو گیا۔ برسوں سے ان کے کانوں نے اپنے محلوں میں، چمن میں، جاگیروں پر، ناؤنوش کی محفلوں میں اس ایک نام کے سوا اور کچھ مشکل سے ہی سنا تھا۔

مزدک، مزدک، مزدک!!

جہاں جاتے، وہ اسے اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھتے تھے۔ ناقابلِ یقین کہ شاہراہوں سے غلاظت صاف کرنے والے تک ان سے ہم سری کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔

صبح ہونے تک انھیں ان تمام لاشوں کو دفن کرنا تھا۔

خسرو نوشیروان نے تھرتھرائی ہوئی لمبی سانس بھری... پھر اس نے وزرگان سے کہا:

''آپ کا کام اب شروع ہوا ہے۔ کل سے مزدک کا نام صفحۂ سلطنت سے مٹانا شروع کیجیے۔ اس کا اور اس کے مذموم خیالات کا کہیں ذکر نہ ہو۔ اس کا نام بھی کسی کی زبان پر نہ آنے پائے۔ ہمیں اس کو نہیں، اس کی یاد کو قلعۂ فراموشی کے سپرد کرنا ہے۔ ہوشیار اور خبردار! اگر اس کا ذکر کرنا ہی پڑے تو صرف برائی کے ساتھ کیا جائے۔ آنے والی نسلیں بھی اس کے اور اس کے خیالات کے بارے میں چنداں معلومات حاصل نہ کر سکیں۔ آج شب کی اس ساعت سے، مزدک انسانوں کی یادداشت سے رخصت ہوا۔''

مضبوط نپے ہوئے قدموں سے خسرو نوشیروان اپنے محل کی طرف چلا گیا۔ دوسری صبح سے اسے کام میں مصروف ہو جانا تھا۔ اسے پل بنانے تھے اور طیسیفون کا حصار کرتی دیوار کو مضبوط کرنا تھا۔ وہ معمارِ سلطنت تھا۔ جس کے حصار میں نسب اور جاگیریں محفوظ رہیں گی اور خیرات کے لیے

اس کے لنگر خانے کبھی بند نہ ہوں گے۔

دوسرے دن شہر میں سناٹا تھا۔

مزدک اور اس کے تمام پیشوا غائب تھے۔ اس کے مریدوں کا مجمع گھروں میں روپوش تھا۔ اس روز سہ پہر کو طیسیفون سے شمال کی طرف جانے والی جنگلات میں گھری پگڈنڈی پر ایک چھوٹے سے چھکڑے میں خاک آلود چہرہ لیے ایک کرد کان کن دیکھا گیا جس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں اور جو اپنی بیوی اور تین بچیوں کے ساتھ بہت دور اپنے گاؤں واپس جا رہا تھا۔

۴۰

اور وقت تو گزر گیا۔

کدھر گیا وقت؟ کدھر جاتا ہے؟

دائیں بائیں، آگے پیچھے؟ اوپر نیچے؟

موسمِ گرما کی ایک صبح ایک سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی اپنی درسگاہ دختران کا سفید لباس پہنے اور آنچل میں ایک کتاب چھپائے دھیرے دھیرے درسگاہ سے ملحق طالبات کے رہائشی کمروں کی سیڑھیاں اتر کے کھیلوں کے میدان کی پشت کی طرف جا رہی تھی۔ دوسری طالبات کی نظروں سے اوجھل ہو کر وہ سفید چکنے پتھر کے ایک بڑے سے چبوترے پر بیٹھ گئی اور اس نے آنچل ہٹا کر کتاب پڑھنی شروع کی۔

''آج یورپ ایک عفریت سے خوفزدہ ہے... کمیونزم کا عفریت...''

لڑکی نے پہلا جملہ پڑھا۔ اسے دس بجے شہر کی بڑی درسگاہ میں ایک لڑکے سے ملنا تھا جس نے اسے یہ چھوٹی سی کتاب پڑھنے کے لیے دی تھی۔ ابھی صرف آٹھ بجے تھے۔ اس کے پاس وقت تھا۔ وقت...

اگر وقت کو مہ و سال سے ناپیں تو اس کے قبائل کو ان سرزمینوں میں داخل ہوئے پورے دو ہزار برس گزر گئے تھے۔ وہ کمبوچ قبائل تھے جن کو ہند کے راجاؤں نے پہلے واپس دھکیل دیا تھا، لیکن وہ دوبارہ یہاں آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ٹکڑوں ٹولیوں میں وہ جہاں تہاں نکل گئے تھے۔ وہ معلم تھے اور منجم تھے۔ دھیرے دھیرے وہ ہند میں رچ بس گئے تھے، اور معلموں اور منجموں کی اعلیٰ ترین جات اور گوت کے نام سے جانے جاتے تھے۔ پھر عرب استھان سے اٹھنے والے ایک دین کو ان میں سے کچھ نے اپنا لیا تھا، جس کے پیرو گھوڑوں کی پشت پر سوار، اونٹوں پر لدے یا پاپیادہ ہی ان زرخیز، کئی دریاؤں اور رم جھم برساتوں والی زمینوں میں آتے رہتے تھے۔ وہیں دو بڑے دریاؤں، گنگا اور جمنا کے بیچ بسے شہروں میں سے ایک میں اس لڑکی کے پرکھوں نے بسیرا کیا تھا۔

دور شمال میں بحرِ ذخار سے گھرے ایک جزیرے پر جہاں کچھ قبیلے اور کنبے آباد تھے، رومیوں نے پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا اور ان میں کتنے ہی وہاں بس گئے تھے۔ لیکن یہ تسلط زیادہ عرصے قائم نہیں رہا۔ ایک برّی ٹکڑے کے باسیوں نے اس جزیرے پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ رومی

اقتدار کے دوران یہاں کے قبائل اور کنبے رفتہ رفتہ مسیحی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد بہت سرد زمینوں سے آنے والے بحری جنگجوؤں نے اس جزیرے پر کئی بار حملے کیے۔ اور ان کی سرزمین کو تاراج اور باشندوں کو برباد کرنے کے بعد ان میں سے بیشتر وہیں بس گئے اور صدیوں کا پہیہ ان پر اس طرح گھومتا گزرا کہ ان کا ایک دوسرے سے علیحدہ شناخت کرنا ممکن نہ رہا۔ وہ آپس میں رل مل گئے اور مسیحیت سب نے اختیار کر لی۔ وقت کے ساتھ وہاں ایک بادشاہت ابھر آئی جس کے تاجر اور سپاہ اپنے شاندار بحری جہازوں میں طوفانی لہروں سے کھیلتے دنیا پر تسلط قائم کرنے کے لیے نکلے اور اتنے کامیاب رہے کہ ان کا سامراج ماضی کی رومی اور ایرانی سلطنت سے ٹکر کھانے لگا۔ اس جزیرے پر رہنے والوں کا اولین نام ''برطانوی'' تھا اور بالآخر یہی نام اس ملے جلے کئی قبائل اور کنبوں کے مجموعے کا بھی پڑا اور جزیرے اور اس سے ملحقہ علاقوں کو ''برطانیہ'' کے نام سے جانا گیا۔

اسی سلطنتِ برطانیہ کی تاجروں کی تنظیم، سپاہ اور عمال نے اس طویل وعریض برصغیر کو اپنا محکوم بنالیا تھا جسے ''ہندوستان'' کا نام دیا گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ اس لڑکی کے پُرکھے وہاں بھی نہ رہ سکے اور دوسرے متعدد خانوادوں کے ساتھ ہند کے جنوب مغرب کی سمت بڑھتے بڑھتے نئی زمینوں تک آ پہنچے اور پھر یہیں بس گئے۔

اب یہ لڑکی ایک خوبصورت صاف ستھرے شہر میں تھی جو ایک لبالب چھلکتے دریا کے کنارے آباد تھا۔ اسے سندھونڈی کہتے تھے، لیکن جسے اب بھی مقامی لوگ پیار سے ''مہران'' کے نام سے یاد کرتے تھے جسے کبھی آریانوں کے ایک جنگجو سالار نے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ پار کیا تھا اور اس کا نام اپنے کنبے کے نام پر رکھ دیا تھا۔

یہاں سے چند سو فرسخ کے فاصلے پر ایک وسیع وعریض قلعے کے کھنڈر تھے۔ شاید یہ دنیا کا سب سے بڑا قلعہ تھا۔ اس کی تاریخ اب کسی کو ٹھیک سے یاد نہ تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے کس نے بنایا لیکن ایک خیال یہ بھی تھا کہ ہزاروں برس پہلے دور ایران سے آنے والے ساسانیوں نے اس قلعے کی تعمیر کی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے باسی اسے ''رنی کوٹ'' کے نام سے ہی جانتے تھے۔ اس کے پاس ہی ایک عجوبہ جنگل تھا جو بہت قدیم تھا اور جس کے درخت مٹی میں مل جانے کے بدلے پتھرا گئے تھے۔ اس شہر میں آنے والے اکّا دکّا سیاح اسے دیکھنے بہت شوق سے جاتے تھے۔

ملک پر فوجی سپہ سالار کی حکومت تھی۔ وہ ہان تھا، جسے اب خان کہا جانے لگا تھا۔ ہُنا قبائل کا یہ نام ان دو ہزار برسوں میں تعظیم کا لقب بن گیا تھا۔ شاید وہ خود ہُنا قبیلے کا نہیں تھا۔ تین دن پہلے، شہر کے پرانے حصّے کی ایک گلی میں، ایک چھوٹے سے مکان میں درسگاہوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی

ایک خفیہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف پھیلی ناانصافیوں سے بیزار تھے۔ ''دولت اور زور زبردستی کا راج آخر کب تک؟'' ان میں سے ایک نے کہا تھا۔ ''گاؤں میں ہاریوں کی حالت غلاموں سے بدتر ہے۔ شہروں میں غریبوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ان حالات کو بدلنا چاہیے...''

لڑکی غربت کا ذائقہ چکھ چکی تھی۔ اس کا باپ اس کے بچپن میں ہی دنیا سے رخصت ہو گیا تھا اور اس نے ایک یتیم بچی کی زندگی گزاری تھی۔ پھر جب ان کے ساتھی نے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کچھ کتابیں بانٹیں تو لڑکی نے بہت اشتیاق سے ایک چھوٹی سی کتاب کا انتخاب کیا۔

لڑکے اور لڑکیاں زیرِلب ایک دوسرے سے باتیں کرتے تنگ دروازے سے قطار باندھ کر نکلنے لگے۔ ''حالات بدل سکتے ہیں... کیوں نہیں بدل سکتے۔ دوسرے ملکوں میں یہ سب کچھ ہوا ہے۔ ان امراء کی تمام دولت لے کر سب لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دینی چاہیے۔''

ایک لڑکا یہ سن کر مسکرایا۔

''مساوات!'' اس نے کہا۔

سب نے سر ہلایا۔ ''مساوات...'' انھوں نے سرگوشی میں دُہرایا۔ ''ہم سب کے دل کی ایک ہی آواز ہے۔''

لڑکی نے پھر اپنی کلائی پر بندھے کم قیمت وقت پیما پر نظر ڈالی۔

اب اسے چلنا چاہیے۔

کتاب بند کرتے ہوئے اچانک اس کی نظر اس کتابچے کے مصنف کی تصویر پر پڑی۔ سیاہ بال اور داڑھی، زیرک آنکھیں، لبوں پر ایک طنزیہ تبسم...

لڑکی کے دماغ میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ مصنف جرمن تھا۔ اس کا باپ تو عیسائی تھا، لیکن وہ کبھی ایک یہودی خاندان تھا۔ ساٹھ ستر برس پہلے وہ مر کھپ چکا تھا۔

وہ اپنے وطن سے کبھی باہر نہیں گئی تھی، اور نہ کسی یورپین سے ملی تھی۔

پھر کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا، یہ بالکل عجیب سا احساس، جیسے اس نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے۔ کہیں بہت غور سے دیکھا ہے... اور اس نے لڑکی کو کوئی چیز دی تھی۔

تصویر کی آنکھیں لڑکی کو ہمدردی سے دیکھ رہی تھیں۔ لڑکی کو لگا جیسے اس کی مسکراہٹ اب طنزیہ نہیں رہی تھی۔ ان آنکھوں میں جیسے کوئی پہچان ہو۔

اس نے جلدی سے کتاب بند کر کے اپنے جھولے میں ڈال لی۔ پھر وہ تیز قدموں سے درسگاہِ دختران کے سبز چوبی دروازے کی طرف چل دی۔

پس نوشت

پھر کیا ہوا؟

مزدک کے پیرو صفحۂ ہستی سے بالکل نیست و نابود نہیں ہوئے تھے۔ کئی مؤرخین کی رائے میں وہ عرب فاتحین کے غلبے کے بعد بھی روپوشی میں موجود رہے۔ عباسی خلافت کے دور میں بابک خرم دین (بابک خرمّی) کی بغاوت کو مزدکیوں کی حمایت حاصل تھی۔

فرہنگ

آزادگان: موروثی نجیب۔ ان میں افواج کے سالار اور سپہ سالار بھی ہوتے تھے

اَوِستا: زرتشتیوں کا مقدس صحیفہ

برسم: جنگلی چنبیلی یا انار کی ایک بالشت لمبی شاخیں جو چڑھاوے کے لیے آگ میں ڈالی جاتی ہیں

جوشن: بازوبند

حصیری اوراق: پرانے کپڑے سے بنے ہوئے کاغذ

دخمہ: تابوت جس میں پارسی اپنے مردے کو رکھتے ہیں

دہقانان: زمین دار جو کسانوں سے لگان وصول کرتے تھے

رمنا: گھاس کا میدان

سپاہ بذ: سپاہ سالار

سوگند: گندھک (قسم کھانے کے لیے پی جاتی تھی)

شہرداران: صوبوں کے نواب یا شاہ

عرفانی: صوفی

عمال: سرکاری افسر، بیوروکریٹ

کرشان / کرسان: کسان

ماہ دزد: قدیم ایران میں ایک مہینے کا نام

مرزبان: سرحد کا افسر، حاکم سردار

موبدِ موبدان: زرتشتی پیشواؤں کا اعلیٰ ترین سربراہ

موبد: زرتشتیوں کی عبادت گاہ، آتش کدے کا پیشوا

نسک: اَوِستا کی آیات کے ابواب

نوموتیں: سزائے موت کا ایک طریقہ جس میں نو طریقوں سے اذیت دے کر مارا جاتا تھا

واسپہران: سلطنت کے سات ممتاز خاندان جو شہنشاہ کی تاج پوشی کرتے تھے

وزرگان: امراء، رئیس، بڑے جاگیردار

ہربز: امراء کا ایک طبقہ

ہزبد: رسالدار

یزد: طاقت، قوت (الوہی)

قلعۂ فراموشی

فہمیدہ ریاض

یہ تاریخی ناول تاریخ کے سب سے پہلے سوشلسٹ انقلابی مزدک کی کہانی ہے جو چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں ورودِ اسلام سے قبل، عظیم الشان ایرانی اور رومن سلطنتوں کے ٹکراؤ میں گندھی ہے اور جس میں ان سلطنتوں کے اطراف پھیلے عرب اور سفید ہن قبائل ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مصنفہ نے اسے انفرادی اور گروہی آرزوؤں اور تمناؤں، محبت اور نفرت، دانش مندی اور جذبات، رحم دلی اور سفاکی کے ایسے جال کی طرح پیش کیا ہے جسے معروضی حالات ایک المیہ بنا دیتے ہیں اور جو انسانی فطرت کے تضادات کے باعث ایک مزاحیہ پہلو سے مبرا نہیں۔ یہ اس زمانے کی داستان ہے جب تاریخ، ماقبل تاریخ کے بطن سے تازہ تازہ پیدا ہوئی تھی اور جب مذاہب ارتقائی منازل میں تھے۔ یہ ان شہروں کی کہانی ہے جو اب وجود نہیں رکھتے اور ان دریاؤں کی جن کے رخ بدل چکے ہیں۔ ساتھ ہی یہ تاریخ میں انسانوں کی مساوات کی جدوجہد کے تسلسل کی روداد بھی ہے جو بلوچستان سے دریائے سندھ تک پھیلی ہے جہاں کبھی ایرانی سلطنت کا پرچم لہراتا تھا اور جو سترہ سو برس قبل مزدکی تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔

مصنفہ کے بارے میں: فہمیدہ ریاض جنوبی ایشیا کی نامور شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ وہ ۱۹۴۶ء میں میرٹھ، ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور عمر کے اوّلین برس حیدرآباد، سندھ میں گزارے۔ انھوں نے حیدرآباد اور اس کے بعد برطانیہ میں تعلیم حاصل کی۔ فہمیدہ ریاض کا پہلا شعری مجموعہ پتھر کی زباں، ۱۹۶۷ء میں اور دوسرا مجموعہ بدن دریدہ، ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ فہمیدہ ریاض نے پاکستان میں جمہوریت کے لیے عملی جدوجہد کی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد میں انھوں نے سیاسی جلاوطنی کے سات برس گزارے۔ ۱۹۹۷ء میں انھیں انسانی حقوق کے بین الاقوامی ادارے ہیومن رائٹس واچ کا ’ہیمٹ ہیلمن ایوارڈ‘‘ دیا گیا جو اہلِ قلم کے لیے مخصوص ہے۔ ۲۰۱۰ء میں انھیں حکومتِ سندھ کی جانب سے ’’شیخ ایاز ایوارڈ‘‘ اور صدرِ پاکستان کی جانب سے ’’تمغۂ حسنِ کارکردگی‘‘ دیا گیا۔ ۲۰۱۶ء میں انھیں پاکستان میں ادب کا اعلیٰ ترین ایوارڈ ’’کمالِ فن‘‘ دیا گیا ہے۔ فہمیدہ ریاض کراچی میں رہائش پذیر ہیں اور مستقلاً تحریر و تدوین میں مصروف رہتی ہیں۔

ISBN 978-0-19-940505-3

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

RS 425

www.oup.com
www.oup.com.pk